عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ

طلوعِ اسلام

اپریل ۱۹۴۱ء

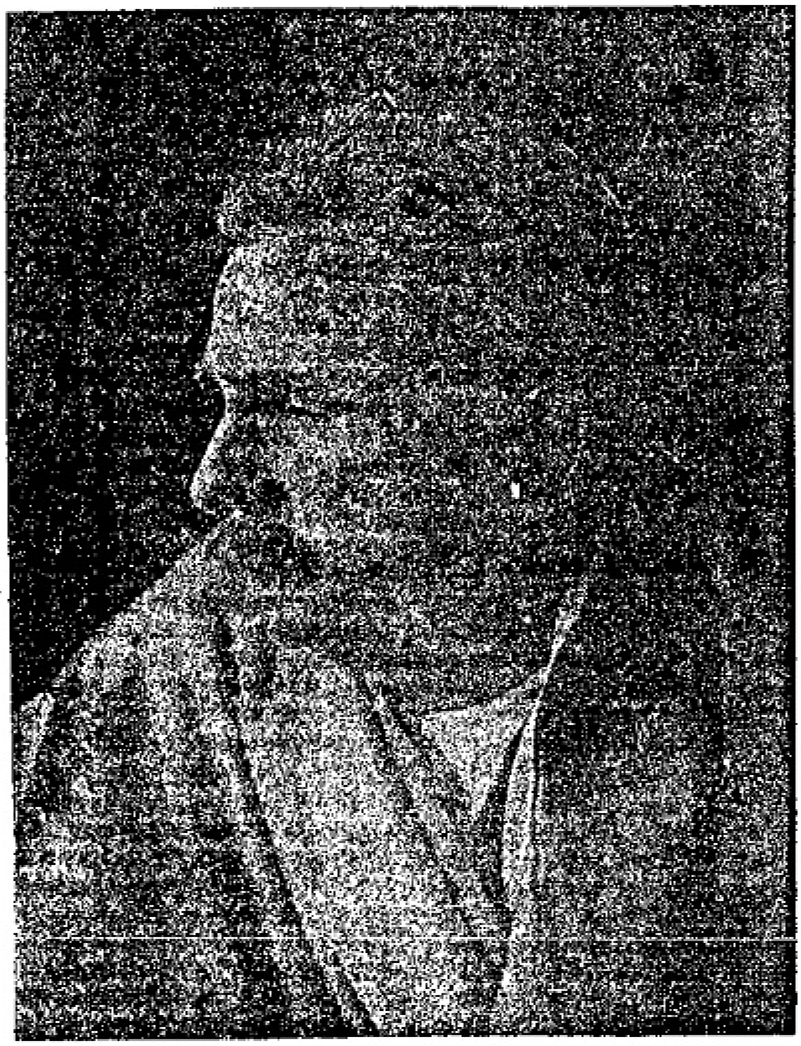

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتب	بدل اشتراک	
اخوندزادہ حسین امام	سالانہ	پانچ روپیہ 5/-
	ششماہی	تین روپے 3/-
جلد (۴) شمارہ (۴)	فی پرچہ	آٹھ آنے

ربیع الاول سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۱—۳۴
نقد و نظر	ادارہ	۳۵—۴۰
فردوسِ گم گشتہ	از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۴۱—۵۹
صحرا	از جناب اسد ملتانی	۶۰
جرم و گناہ	از جناب مشتاق احمد خاں صاحب افغان فاضل دیوبند و مولوی فاضل	۶۱—۷۲
حقائق و عبر	ادارہ	۷۳—۸۰

لمعات

اعمال کا جائزہ، نفس کا محاسبہ۔ اپنی سعی و کاوش کی جانچ پڑتال نہایت ضروری ہے سفرِ حیات میں جو راہرو وقتاً فوقتاً یہ نہیں دیکھتا کہ وہ کتنا آگے بڑھ آیا ہے۔ اور منزل سے ہنوز کس قدر بُعد ہے۔ اُسے منزل تک پہونچنے کا یقین نہیں رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ جس راہ پر گامزن ہو وہ اُس کی منزل کی راہ نہ ہو۔ جو مریض گا ہے گا ہے اپنی رفتارِ صحت کا جائزہ نہیں لیتا وہ شفایابی کی واثق امید نہیں رکھ سکتا کہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ علاج صحیح اسلوب پر ہو رہا ہے، یا نہیں۔ جو طالب علم امتحان میں نہیں بیٹھتا وہ اپنی قابلیت و استعداد کے متعلق کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔ جو دوکاندار اپنے آمد و خرچ کا حساب نہیں کرتا وہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی تجارت نفع مند ہے، یا خسارہ انگیز۔ پھر جس قدر کسی کی زندگی سعی و عمل اور جد و جہد کی زندگی ہوگی۔ اسی قدر محاسبہ اور موازنہ کی ضرورت اشد ہوتی جائیگی۔ پتھر کو کیا ضرورت کہ وہ قوت نشو و ارتقا کی اثر اندازی کا جائزہ لیتا پھرے۔ یا نخل صنوبر کو کیا حاجت کہ وہ مسافت و منازل کی وسعت پیمائیاں کرتا پھرے۔ بیٹھنے والے کو رفتار کے پیمانوں سے کیا واسطہ! سونے والے کو وقت کی اقدار سے کیا تعلق!! یہ چیزیں تو جاگنے اور چلنے والوں سے متعلق ہیں۔ اسلام کے نزدیک زندگی جوئے رواں ہیں۔ اس کا خدا كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ[1] کا مظہر ہے۔ اس لئے اس خدا کی صفات کو اپنے اندر مرتسم کرنیوالوں کی زندگی بھی اسی نہج و اسلوب کی ہونی چاہئے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان اقبالؒ

---

[1] ہر لمحہ نئے انداز اور نئی شان میں۔

جس کی زندگی ہر لحظہ ایک نئی آن اور نئی شان کی حامل ہو۔اس کے لئے ہر سانس پر محاسبہ اور ہر قدم پر موازنہ ضروری ہے۔جب انفرادی زندگی میں محاسبہ اور جائزہ کا یہ عالم ہے تو ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوجائیگی۔دن میں پانچ مرتبہ نماز وں کے اجتماعات۔ہفتہ میں ایک مرتبہ جمعہ کا اجتماع۔عید اور حج کے سالانہ اجتماع۔انفرادی اور ملی اعمالِ حیات کے محاسبہ کی ہی تقاریب ہیں۔طے کردہ مسافت کا جائزہ۔آئندہ کے لئے پروگرام، زندگی آگے بڑھنے کے اسالیب ہیں۔انھی کی نقالی ہے جسے کانفرنسوں کے سالانہ اجلاس اور انجمنوں اور سوسائٹیوں کے وقتاً فوقتاً اجتماعات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ان مجالس واجتماعات کی یہی غرض ہے کہ مقررہ وقفوں کے بعد جائزہ لیا جائے کہ ہم اپنے عزائم کی تکمیل میں کس حد تک آگے بڑھے ہیں اور اس کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے۔

شروع اپریل میں مسلم لیگ کا سالانہ اجتماع ہونیوالا ہے اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس اجتماع سے حقیقی مقصد یہی ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ پچھلے سال کس نقطہ سے آغازِ سفر ہوا تھا۔سال بھر میں ہم نے کیا کیا۔راستے میں کون کون سے سخت مقامات اور دشوار گزار مراحل آئے اور آج ہم کس مقام تک پہونچ گئے ہیں اور اس کے بعد منزلِ مقصود تک ابھی کس قدر فاصلہ باقی ہے۔اور اس مسافت کو طے کرنے کے لئے اب آئندہ کیا کرنا چاہیے۔یہ ہے ان اجتماعات کی غرض وغایت۔آئیے !اس اجلاس کے انعقاد سے پہلے حساب و کتاب (سعی وعمل) کا گوشوارہ مرتب کریں اور دیکھیں کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟ اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ سالِ گذشتہ ہمارے آغازِ سفر کا نقطہ کونسا تھا اور ہم کن حالات کے ماتحت جادہ پیما ہوئے تھے۔

گذشتہ سال لیگ کا سالانہ جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ان کوائف ومناظر کی اجمالی روئداد۔جو اس اجتماع سے متعلق تھے۔طلوعِ اسلام بابت اپریل سنہ۱۹۴۰ئہ کے لمعات میں

شائع ہوئی تھی - چونکہ آجکی دنیا میں واقعات برق رفتاری سے سامنے آتے اور گذرتے جاتے ہیں اس لئے سال بھر پیچھے کی باتیں بہت کم یاد رہ سکتی ہیں تجدید یاد داشت کی غرض سے محولہ بالا لمعات کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں - اگر ضرورت ہو تو پوری داستان کے لئے اپریل ۱۹۴۱ء کا رسالہ خود مطالعہ فرما لیجئے - ان اقتباسات سے اتنا واضح ہوجائیگا - کہ لاہور کا سالانہ اجتماع کن حالات میں منعقد ہوا - اور کون سے عزائم کا تہیّہ کر کے اُٹھا - اس کے بعد سال بھر کی طے کردہ مسافت کا جائزہ لینا آسان ہوجائیگا -

---

"اللہ رے بساطِ سیاست کی فسونگرانہ مہرہ بازیاں ! مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دھوم مچی - وہائٹ ہال کے اربابِ حل وعقد کی آنکھیں ایک طرف منٹو پارک (لاہور) کیطرف لگ رہی تھیں رام گڑھ میں جمع ہونیوالے گنگا جمنی مہاشوں کے کان دوسری طرف ہر پتہ کھٹکنے پر کھڑے ہورہے تھے - انگریز کو اپنی ساحرانہ فسوں سازیوں کی گرفت ڈھیلی ہوجانیکا خطرہ تھا - ہندوؤں کو رام راج کے منصوبے خوابِ پریشاں بنتے نظر آرہے تھے ، وہ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمین کہ جسکے حلقے انگریز کی ہوس استعمار پرستی کے ریشوں سے بٹے اور ہندو کے جذبۂ مسلم کشی کے ہاتھوں کسے گئے - تارِ عنکبوت بنتا دکھائی دے رہا تھا - ایک جداگانہ قوم کے لئے ایک جداگانہ حکومت کے تصورات میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی - سرزمینِ پنجاب کا ایک ایک ذرہ اُبھر اُبھر کر ۲۱ مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا - ہندوستان کے ہر مسلم گھرانے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں بندھ رہا تھا - جگہ جگہ سے خاص تیاریوں کی اطلاعات موصول ہورہی تھیں جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور نوکروڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جانفزا بن رہا ہے - غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پر ایک آفتابِ تازہ کے طلوع کے سامان ہورہے ہیں شپرہ چشم غیروں کو اس آفتابِ جہاں تاب کی ضوفشانیوں سے جو گھبراہٹ ہورہی تھی وہ بالکل بجا اور درست تھی - لیکن ملّتِ اسلامیہ کی شوریدہ بختی کہ خود اپنوں

ہیں سے بھی کچھ ایسے تھے جو اس تقریب کی کامیابی میں اپنے طرۂ امتیاز کی خمیدگی محسوس کرتے تھے، جو سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کا یہ عدیم النظیر اجتماع اور اس اجتماع کے حیرت انگیز نتائج اُن کے چہروں کو بے نقاب کر دیں گے۔ صفِ مخالفت کی بھانپنے والی نگاہوں نے اُن کے چہروں کی اس اُڑتی ہوئی رنگت کو دیکھا۔ اور ایک نرم رو قاصد لاہور بھیجا گیا۔ تخلیہ میں وہ ملاقات ہوئی جسکی تفصیل کے متعلق کراما کاتبین راہم خبر نیست۔ اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کے ولولۂ شوق میں گرمجوشی بڑھتی گئی۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ آنے والے منظر کا تصور نگاہوں میں چمک۔ قلوب میں مسرت آفریں تموج اور دماغوں میں کیفِ طیب پیدا کرنے لگا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں۔ ولولوں نے کروٹ بدلی ہمتیں آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئیں۔ عزائم نے قدم بڑھایا۔ ارادوں نے کمر ہمت باندھی۔ اور یہ قافلۂ شوق رواں دواں جادہ پیما ہوا۔

اُدھر یہ گرمجوشیاں تھیں اور ادھر بعض چہروں کے ہلکے ہلکے تبسمِ پنہاں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے جا رہے تھے۔ لیکن کیفِ عزائم میں سرمست کاروانِ شوق کو فرصت کہاں۔ کہ پردوں کے ارتعاشِ غیر محسوس سے منظرِ پسِ پردہ کا جائزہ لے لے۔ وقت گزرتا گیا۔ مہینے ہفتوں میں بدلتے گئے۔ کہ عین شروع مارچ میں حکومتِ پنجاب کے قصرِ فلک بوس سے جماعتِ خاکساران پر پابندیاں عائد کرنے کے احکامات نافذ ہو گئے۔ لیکن اس کاروانِ شوق نے اِسے پر بھی نہ سمجھا۔ کہ۔

تیرِ نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے،

مہینے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خاکساران کے خلاف پابندیوں نے فضا میں کچھ تموج پہلے سے پیدا کر رکھا تھا۔ کہ جلوسِ صدر مسلم لیگ کے عین دو روز پہلے۔ شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف و اکنافِ ہند میں دوڑ گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلا دی گئی ہے، تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ کرفیو آرڈر جاری ہو گیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ شہر پر فوج اور پولیس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ساری آبادی پر بلا کا سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں۔ ہر متنفس متوحش۔ نہ باپ کو بیٹے کی خبر۔ نہ بھائی کو

بھائی کا علم کاروبار بند۔ دل پژمردہ، ہمتیں پست۔ ولولے افسردہ۔ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا اور لاہور کی یہ حالت! شریک ہونیوالوں میں سے کچھ اپنے اپنے مقام سے روانہ ہو چکے کچھ ٹکٹ بدست۔ اسٹیشنوں پر بیٹھے۔ کچھ راستے کے مقامات میں وقتی آرام کے لئے ٹھہرے ہوئے۔ ہر ایک حیران کہ اب کیا ہوگا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدر جلسہ دہلی میں ہیں استقبالیہ کمیٹی لاہور میں۔ تار پر تار آ رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہا ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے بعد میں بتایا۔ انھیں نہایت "مخلصانہ" مشورہ دیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ پریشانی اور وحشت کے یہ سامان ایک طرف اور وہ عزم و ہمت کا پیکر ایک طرف کہ نامساعدتِ حالات کی تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں اور اس روشنی کے بلند و محکم مینار سے ٹکرا کر خاسر و نامراد واپس لوٹ آتی ہیں، فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ نازک موقع کم ہی آیا ہوگا۔ اس تدبر و استقلال کے مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا۔ لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جائے گا اسنے ان تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر الگ کر دیا۔ اور ۲۰ر کی سہ پہر کو اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام الاوقات کے مطابق، بلا رد و بدل ہوگا۔ البتہ اس حادثۂ الم انگیز کے پیش نظر کہ جسنے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں تقاریب کو کاشانۂ حزن و ملال بنا دیا ہے۔ جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے ۳ گھنٹے بعد یہ پیکر عزم و استقلال حسبِ انتظامات سابقہ اسپیشل ٹرین کے ذریعہ عازم لاہور ہو گیا۔

لاہور پہونچکر قائدِ ملت نے کیا دیکھا یہ تو ان کی چشمِ پرنم کے آنسوؤں سے پوچھئے کہ جنکے ایک ایک قطرہ میں سینکڑوں قیامتیں تڑپتی نظر آ رہی تھیں۔ البتہ دوسروں نے جو کچھ دیکھا اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا ایک فرض کفایہ کی ادائیگی

کے لئے لوگ اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے جانبِ قبرستان لئے جا رہے ہیں، چہرے اُداس دل پژمردہ آنکھوں میں آنسو۔ شہر میں ہو کا عالم، ہر شخص ایک غیر محسوس خوف سے ہراساں۔ سینوں میں آہ و فغاں کا قیامت خیز تلاطم، لیکن حلق "قانونی" پابندیوں کی ریشمیں رسیوں میں جکڑا ہوا دل الم جانگداز کی آتشِ خاموش سے سوختہ لیکن لب "آئینی" قیود کی مضطرانہ بندش سے سر بمہر کہ دھواں تک نہ نکلنے پائے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے پاس نہیں جاتا کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اگر کوئی ڈرتا کانپتا سہما ہوا پاس چلا بھی گیا تو ادھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی بھانپ تو نہیں رہا۔ کوشش کرتا ہے کہ کچھ کہے لیکن جذبات کا تلاطم اور عواقب کا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے وہ کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اُسکی چشمِ حسرت سے ڈھلکتے ہوئے آنسو چپکے چپکے اس کے غم والم کی داستانِ خموشی کا ایک ایک لفظ کہہ ڈالتے ہیں۔ سارا شہر ایک جیلخانہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ جہاں کا ذرہ ذرہ ایک مستقل پاسبان ہو، ادھر اُدھر استقبال کے دروازے۔ نیم تیاری کی حالت میں۔ دو دن پیشتر کی افراتفری کے مرثیہ خواں، گری ہوئی جھنڈیاں۔ ٹوٹے ہوئے قطعات۔ یوں ادھر اُدھر بکھرے پڑے جیسے کسی طوفانِ بلاخیز کے بعد بہہ جانیوالے مکانات کے بقیہ آثار۔ کسی مکان سے ایک چیخ کی دردناک آواز۔ دو دن کے لٹے ہوئے سہاگ کی داستانِ الم انگیز سے فضائے آسمانی کو ماتم کدہ بنا رہی ہے۔ کسی گھر سے ضعف و نقاہت میں ڈوبی ہوئی آہِ لرزاں ایک پیرانہ سال بیوہ کی زندگی کے آخری سہارے کے ٹوٹ جانیکی فریاد بنکر کنگورۂ عرش کو ہلانے جا رہی ہے۔ کسی معصوم کے چہرے کی زردی اُسکے تازہ داغِ یتیمی کا پتہ دے رہی ہے۔ کسی گوشے سے زخمیوں کے کراہنے کی صدائے دردناک، اس حقیقت کی داستان سرا ہے کہ زندگی کا بوجھ ان کے لئے کس قدر ناقابلِ برداشت بن چکا ہے۔ مشہدِ خاکساراں کی خاک کے ذرات بیگناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے رنگین قبا نظر آرہے لیکن فی الحقیقت جینے والوں کے دمکتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی پیشانیوں کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اور ان سب کے ساتھ شاہی مسجد کے جنوبی مینارے کہ جن کی آنکھوں نے دو دن پہلے مظلوم مسلمانوں کو تڑپتے پھڑکتے۔ غلطیدۂ خاک و خون۔ مسلح سپاہیوں کی وحشت اور درندگی

اور ہوسِ خون آشامی کا شکار بنکر ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ بحضور رب ذوالانتقام دستِ بدعا استادہ کہ اے خدائے رؤف و رحیم! صدقہ اُس مرقدِ قلندر کے مقدس آنسوؤں کا جو آج ہمارے سایہ میں محوِ خواب ہے، سرزمین لاہور کو غرق ہونے سے بچالے کہ اس سرزمین کے ذرات کو اس مردِ مومن کی کفش بوسی کی سعادت حاصل ہے۔ جسنے تیرے بندوں کو تیرے نام پر کٹ مرنے کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا۔

ہاں یہ تھا لاہور اور یہ تھی اس کی فضا جس میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ شروع ہوا تو اس افسردگی اور پژمردگی میں۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک مردِ مخلص کا یقینِ محکم و عملِ پیہم کس طرح نبضِ کائنات میں نئے سرے سے تموج پیدا کرسکتا ہے۔ اس کا پنجۂ جنون طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں کے دلآویز نقابوں کو کس طرح تار تار کر دیتا ہے۔ اس کا حسنِ تدبر سیاسی گتھیوں کی پیچ در پیچ گرہوں کو کس حسن و خوبی سے کھولتا جاتا ہے۔ . . . . لیگ کے اجلاس کی ابتدا اور اختتام میں کیفیات و جذبات کا جو نمایاں فرق سامنے آیا اس سے یہ چیز بالکل نمایاں تھی۔ کہ اب مسلمانوں میں کس قدر بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ اور مسٹر جناح کی عظمت کس قدر عوام کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ لاہور کا حادثہ ہر دیدۂ بینا کو خون کے آنسو رلا دینے کا موجب تھا۔ بایں ہمہ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں ایک خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو نہ مسلمانوں کے ضبط و انضباط کا امتحان ہو سکتا۔ نہ مسٹر جناح کی بلندیِ مرتبت کا صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکتا۔ نہ لوگوں کو اس حد تک محسوس ہو سکتا کہ مسلم لیگ ان کے مفاد کی کس درجہ محافظ ہے اور نہ ہی لیگ اور خاکسار ایک دوسرے سے اس قدر قریب آسکتے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس آخری شق میں استقامت پیدا ہو جائے تو شہدائے لاہور کی قربانی رائگاں نہ گئی۔ ربنا الف بینا قلوبنا واجعلنا بنعمتک اخوانا۔

خاکساروں سے متعلق جو ریزولیوشن پاس کیا گیا ہے، وہ یقیناً اطمینان بخش ہے۔ لیکن ہمیں

اسکے ایک جزو سے تھوڑا سا اختلاف ضرور تھا۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ اگر حکومت سے یہ مطالبہ کرنیکے بجائے کہ وہ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرے۔ مسلم لیگ خود ایک آزادانہ تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرتی - - - - - - - - - - اور لیگ کی مجلس عاملہ اس کمیٹی کی رپورٹ پر ضروری مواخذہ کرتی۔ بہرحال جو کچھ اجلاس نے منظور کیا۔ وہ مسلمانوں کے اجتماع کا متفقہ فیصلہ ہے۔ جسکے بعد ہمیں اختلاف کا حق حاصل نہیں رہتا۔ اب ہم ارباب لیگ کی خدمت میں اتنا عرض کرینگے کہ وہ اس معاملہ کو اختتام تک پہونچا کر اطمینان کی سانس لے۔ یونہی ادھورا نہ چھوڑ دے۔ اور اس تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت وغیرہ کا کام بھی صرف خاکساران یا دیگر متعلقہ اشخاص کے ذمہ ہی نہ چھوڑ دے۔ بلکہ اسمیں خود بھی مدد کرے لیگ کے ارباب بست وکشاد کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کی خاطر ان کی صد سالہ نرم وگرم کوششیں ایک طرف اور ایک بیگناہ مسلمان کا خونِ ناحق ایک طرف۔ خونِ ناحق کا پلڑا پھر بھی جھکتا رہے گا۔ کہ

من قتل مومنا متعمدا فجزاءہ جہنم خالدا فیہا ابدا

جس نے کسی ایک مسلمان کو بھی عمداً قتل کر دیا۔ اسکی سزا جہنم ابدی ہے
ان کے اس خدا کا فیصلہ ہے جو تمام اعمالِ انسانی کا صحیح صحیح جائزہ لینے والا ہے

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ اس خون کی ہولی سے متعلق تھا۔ جو ۱۹ مارچ کو لاہور میں کھیلی گئی۔ لیکن مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ اسمیں اس قیامت خیز سانحہ کے نتائج وعواقب کو اس حسن وخوبی سے سنبھالا گیا۔ لیگ کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا۔ اور ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ خوش نصیب مسلمان جنھوں نے اس اجلاس کو بچشم خویش دیکھا ہے۔ وہ محسوس کریں گے کہ آنکھوں سے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری کی پوری تاریخ کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلم تھا جسمیں پہلے یہ دکھایا گیا۔ کہ ایک قوم جب طاغوتی طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوتی ہے تو اس پر کس قدر

افسردگی چھا جاتی ہے، اس کے قوائے عملیہ کس قدر مضمحل ہو چکے ہیں۔ اس کا دل آرزوؤں اور ولولوں کا نشیمن ہونے کے بجائے کس قدر حزن و یاس کا کاشانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اسکے بعد جب اس قوم میں ایک رہبرِ فرزانہ پیدا ہو جائے تو وہ کس طرح پوری کی پوری فضا کو بدل کر قوم کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ مسلم لیگ کے متعلق آج تک یہ کہا جاتا تھا کہ بالآخر اس کے سامنے پروگرام کیا ہے۔ اسکی تگ و دو کا منتہیٰ کیا ہے، اس کے سامنے نصب العین کونسا ہے۔ لاہور کے اجلاس نے واضح اور بیّن الفاظ میں بتا دیا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے۔ ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آرہے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی گتھیوں کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انھیں دوسرے حصۂ ملک سے الگ کر کے، ایک جداگانہ آزاد حکومت قایم کیا جائے، صدر مسلم لیگ مسٹر جناح گذشتہ دو برس سے جس نہج سے قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے دیکھنے والی آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں کہ انکی منزلِ مقصود کیا ہے۔ حتیٰ کہ ہم نے مارچ کے پرچہ میں مسٹر جناح کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا تھا اسمیں اس منزل کا پتہ نشان بھی کھلے کھلے الفاظ میں بتا دیا تھا۔ پہلے انھوں نے اعلان کیا کہ مسلمان ایک اقلیت یا فرقہ نہیں۔ بلکہ ایک مستقل بالذات جداگانہ قوم ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہندوستان ایک واحد ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک ہے پھر اور آگے بڑھے تو ارشاد فرمایا کہ مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت مسلمانانِ ہند کے نزدیک قطعاً قابلِ قبول نہیں۔ جب یوں آہستہ آہستہ زمین تیار ہو گئی۔ جب قوم نے ایک مرکب کے مختلف عناصر ترکیبی کو یوں الگ الگ دیکھ لیا تو اس کے بعد ۲۲ر مارچ کی سہ پہر اپنے خطبۂ صدارت میں اور اس کے بعد ۲۳ر مارچ کے کھلے اجلاس میں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ اس حقیقتِ ثابتہ کا اعلان کر دیا کہ مسلمانانِ ہند کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ان علاقوں میں جہاں انکی اکثریت ہے اپنی آزاد اور جداگانہ حکومت قایم کریں گے، جہاں نہ انگریز کا عمل دخل ہو گا اور نہ ہندو کا اثر و تسلط۔ جب ایک واضح اور درخشندہ نصب العین سامنے آجاتا ہے تو اس وقت قوم کے دلوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ الفاظ میں نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس کا اندازہ تو اس پنڈال سے لگ سکتا تھا جسمیں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ یوں محسوس

ہوتا تھا کہ فی الواقع مسلمان ایک نئی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اس اعلان نے مسلمانانِ ہند کے تصورات کی دنیا کو بدل دیا۔ اُن کے احساسات میں ایک نئی رُوح پھونکدی۔ ہندوستان میں نئی نشاۃ ثانیہ کا سنگِ بنیاد رکھدیا ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

ہاں تو لیگ نے اس ریزولیوشن سے مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک نئی زندگی کا دروازہ کھولدیا۔ اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کا نصب العین یقیناً ایک نئی زندگی کی تمہید ہے۔ اس امر کی مخالفت اگر کہیں سے ہو سکتی تھی تو اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کی طرف سے ہو سکتی تھی لیکن ان صوبوں کے مسلمان نمایندوں نے جس وسعت اور کشادگیٔ قلب سے اس ریزولیوشن کی تائید کی۔ وہ اس امر کا آئینہ دار تھا کہ مسلمان اب کس طرح اپنے انفرادی مصالح کو ملت کے کلی مصالح پر قربان کر دینے پر بسر و چشم آمادہ ہے۔ ہم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو اُن کے اس طرزِ عمل پر دُور ہزار مبارکباد سمجھتے ہیں اللہ انھیں خوش رکھے، انھوں نے فی الواقع بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔ لیگ کے اس ریزولیوشن کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ وہ مسلمان جو اِس وقت تک لیگ کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اب کس بنا پر اس کی مخالفت جاری رکھیں گے! لیگ کا نصب العین واضح ہو گیا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے اس نصب العین کی مخالفت کر سکتا ہے۔ اس وقت تک جو کچھ پریس میں آچکا ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس ریزولیوشن نے ہندوؤں کو کس طرح آتش در پیرہن کر دیا ہے۔ مہاسبھائی اور کانگریسی نرم اور گرم سب بیک زبان اس کی سخت سے سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا یہی امر اس چیز کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ یہ نصب العین کس طرح مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق ہے، اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ جس چیز سے شیطان ناراض ہو وہ یقیناً اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوا کرتی ہے تو اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو مسلمان کہلاتے ہوئے اس باب میں غیر مسلموں کی تائید کرتے ہیں۔ حق و باطل کے امتیاز کی یہ کیسی عمدہ کسوٹی ہے۔

آئیے اور خود امتحان کر لیجئے۔

لیکن ایک چیز ابھی لیگ سے بھی کہنی باقی ہے۔ کہنے کو تو یہ ریزولیوشن چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک کھلا ہوا اعلانِ جنگ ہے تمام غیر مسلم قوتوں کے خلاف! لہٰذا اس امر کا خوب اندازہ کر لینا چاہیئے کہ اس نصب العین کے حصول کے لئے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ یہ حکومت و سلطنت خریدنے کا سودا ہے اور اس جنسِ گراں مایہ کی قیمت میں ایک قوم کو اپنی عزیز ترین متاع قربان کرنی پڑا کرتی ہے

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

لہٰذا اب وہ وقت آچکا ہے کہ جو اس میدان میں آئے سربکف اور کفن بدوش آئے۔ اللہ کی نصرت اس کے ساتھ ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ مسٹر جناح نے اپنی عمر میں سب سے پہلی مرتبہ اس امر کا اعلان کیا کہ اب وہ نصب العین ہمارے سامنے آگیا جسکے حصول کی خاطر میں اپنی جان پر کھیل جانیکو تیار ہوں لیگ کے علاوہ وہ اسلامی انجمنیں جو اس نظریہ کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں ہم اُن کی خدمت میں بھی گذارش کرینگے کہ اب انکیلئے اپنی جماعتوں کو الگ الگ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ان تمام جماعتوں کو لیگ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ بلکہ لیگ ہی میں مدغم کر دیا جائے۔ اور یوں تمام ذرّات سمٹ کر چٹان بن جائیں کہ وقت بڑا نازک ہے اور مرحلہ سخت دشوار۔ ہمیں اس امر کا بھی احساس ہے کہ لیگ کا موجودہ ریزولیوشن ہمارے بعض انتہا پسند نوجوانوں کے معیار سے ابھی نیچے ہے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ لیگ نے جو راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ تو اسی طرف جاتا ہے جو آپکی منزل ہے۔ لیگ کا نصب العین آپکی منزل سے ایک قدم پیچھے سہی۔ لیکن جب تک آپ اس منزل تک پہونچیں گے اگلی منزل کس طرح سامنے آئیگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اور تو اور لیگ کا یہ ریزولیوشن خود ہمارے نصب العین سے بھی ایک قدم پیچھے ہے، لیگ کے سامنے سردست آئینی انقلاب ہے اور ہم خالص حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے حامی ہیں۔ لیکن ہمارے نصب العین تک پہونچنے کیلئے بھی یہ راستہ کی منازل ضروری ہیں۔ لہٰذا اس وقت سب سے پہلا کام لیگ کے مجوزہ

نصب العین کا حصول ہے۔ اس کے بعد آگے قدم اُٹھایا جائے گا۔ جو اعتراض آپ کے دل میں اس وقت موجزن ہے، اس کا اندازہ ہم آپ کی پیشانی سے کر رہے ہیں۔ لیکن یقین مانیئے کہ جب آپ سب کے سب لیگ میں آجائیں گے اور لیگ اپنے اس نصب العین کے حصول میں کامیاب ہو جائیگی۔ تو پھر وہ کچھ کبھی نہیں ہوگا جو آج پنجاب میں ہو رہا ہے پھر مسلمانوں کا خون اس طرح پانی کی طرح ارزاں نہیں ہوگا۔ یہ تو سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ آپ حضرات ساتھ شامل نہیں ہیں چراغ کے نہ ہونے کا نام اندھیرا ہے چراغ لے آئیے۔ اندھیرے کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ باقی نہ رہے۔ ان الباطل کان زھوقا۔ آپ آئیے اور لیگ میں شامل ہو کر اسے تقویت دیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ

یک گردشِ چرخِ نیلوفری
نہ دارائی ماند نہ اسکندری"

خاتمہ اقتباسات

یہ تھے وہ روح فرسا اور حوصلہ شکن حالات جن میں لیگ کا لاہور کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اس اجتماع میں دو اہم ریزولیوشن پاس ہوئے۔ یعنی مسلمانانِ ہند کے اس اجتماع نے دو اہم امور کا عزم راسخ کیا۔ وہ امور یہ تھے۔

(۱) علیحدگی کی اسکیم (جسے عام طور پر "پاکستان" کہا جاتا ہے) اور

(۲) مسئلہ خاکساران میں تحقیق و تفتیش اور عدالت گستری و دادرسی۔

پاکستان کے متعلق مخالف قوتوں کی تگ و تاز کا ذکر بعد میں آئے گا پہلے تائید و موافقت کی مساعی کو دیکھئے۔ یہ نظریہ مسلمانانِ ہند کے سامنے ۱۹۳۰ء سے موجود تھا جب حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے مشہور خطبۂ صدارت (مسلم کانفرنس الہ آباد) میں شمالی ہند میں ایک اسلامی خطۂ حکومت کے قیام کی تجویز کو پیش کیا تھا۔ اس وقت لوگوں نے اسے ایک "شاعر" کی قوتِ متخیلہ کی نادرہ کاری یا ایک "فلاسفر" کے جہانِ تصورات کے ناقابلِ عمل

نظریہ سے زیادہ وقعت نہ دی۔ لیکن دس برس کی صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کے بعد کاروانِ وحشت سیاست کو تھک تھکا کر وہیں آنا پڑا۔ لیکن اسیر تھی۔ سالِ گذشتہ ابھی لوگوں کو یقین نہ تھا کہ مسلم لیگ نے سچ مچ اس تجویز کو مقصدِ زندگی بنا لیا ہے۔ اکثر اُسے محض ایک "سیاسی دھمکی" سمجھتے تھے اور بس۔ لیکن اس ایک سال میں۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کا کوئی اپنا پریس نہیں۔ مبلّغین کی کوئی منظم جماعت نہیں۔ بڑی سرمایہ نہیں۔ لیکن ایک مردِ مخلص کا جنون ہے۔ کہ اس نے اس "سیاسی دھمکی کو ناقابلِ انکار حقیقت" کے طور پر منوا دیا ہے۔ اور آج اپنے بیگانے۔ دوست دشمن، سب اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں کہ فی الواقعہ مسلمانانِ ہند نے اس منصوبہ کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ اور یہ نظریہ "شاعر کا تخیل" فلاسفر کا فضائی تصور۔ مدبر کا سیاسی حربہ (Political stunt) نہیں بلکہ ایک قوم کا عزمِ راسخ۔ ان کے جہانِ تگ و دو کا محور۔ اُن کی اُمیدوں کا مرکز۔ اُن کی تمناؤں کا نقطۂ ماسکہ اور اُنکی زندگی کا محبوب ترین نصب العین ہے۔ نہیں بلکہ فطرت کے اٹل اصولوں کی طرح ایک اصولِ محکم ہے۔ جسے دُنیا کی مخالفت جھٹلا نہیں سکتی کسی کے مشئوم ارادے غلط نہیں ٹھہرا سکتے۔ "مسلمان اور اسلامی حکومت" ایک حقیقتِ ثابتہ ہے جسمیں کسی شک و شبہ۔ کسی وہم و گمان۔ کسی ظن و تخمین کی گنجائش نہیں۔ انہٗ الحق کما انکم بہ تنطقون

لاہور "ریزولیوشن" چونکہ اس منتہائے نگاہ کی اولیں کڑی تھا۔ اس لئے بعض لوگوں کے دل میں اُسکی مزید وضاحت کے متعلق طرح طرح کے خیالات موجزن تھے۔ لیکن اس ایک سال کے عرصہ میں مسٹر جناح نے اپنی مختلف تقاریر میں اسکے بہت سے گوشوں کو اس انداز سے واضح کر دیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس ناخدائے کشتیٔ ملت کی نگاہ ہوں کے سامنے ساحلِ مقصد بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر موجود ہے۔ اور اس نے کشتی کا رُخ پورے حتم و یقین کے ساتھ متعین کیا ہے۔ کراچی کی ایک تقریر میں اُنھوں نے میمن برادری کے تجارت پیشہ حضرات کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم مختلف ممالک اور ملک کے متنوع گوشوں میں بکھرے پڑے ہو۔ لیکن

اب وقت آگیا ہے کہ پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹو اور پاکستان کی سرزمین میں آکر اپنے تجارب و مشاہدات سے ملت کو متمتع کرو۔ اس سے بھی آگے بڑھیے۔ احمد آباد کی ایک تقریر میں انھوں نے واضح طور پر فرما دیا کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ ہم اس سرزمین میں قوانین شریعت کا آزادانہ نفاذ کرسکیں۔ (ان تقاریر کی تفاصیل طلوع اسلام میں شایع ہو چکی ہیں) مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پاکستان سیشن (منعقدہ لاہور۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت کے دوران میں انھوں نے فرمایا

"ہمارے سامنے کوئی معمولی کام نہیں مغل سلطنت کے زوال کے بعد ہم نے سب سے بڑا عزم کیا ہے اور ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ہمیں سب کچھ قربان کرنا پڑیگا" (انقلاب ۳ مارچ ۱۹۴۱ء)

اسی اجتماع میں پرچم لہرانے کی تقریب کے موقع پر آپ نے فرمایا۔

"لاہور کے پلیٹ فارم سے ہی مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور آج اس پلیٹ فارم سے میں یہ اعلان کردینا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک ایسی منزل ہے جہاں تک پہونچنے کے لئے مسلمانوں کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ پاکستان کا تخیل آج ہندوستان کے ایک ایک مسلمان کے دماغ پر چھا چکا ہے۔ بلکہ میں یہاں تک کہونگا کہ پاکستان ہندوستان کی اسلامی سیاست کا جزو بن چکا ہے اور ملک کے ہر حصے کے مسلمانوں میں اسکے متعلق جو جوش و خروش پایا جاتا ہے اسکے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان بن کر رہیگا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے اس نصب العین کو ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہندوستان کے براعظم میں پاکستان کے سوا اور کوئی دستور کامیاب نہیں ہوسکتا"

(انقلاب ۔ ۴ مارچ ۱۹۴۱ء)

مسلمانوں کے اس مطالبہ کی صداقت، عزم کے استحکام اور مسٹر جناح اور ان کے چند مخلص رفقائے کار کی دیانت اور خلوص کا یہ اثر ہے کہ آج قریہ بہ قریہ، شہر بہ شہر، کوچہ بہ کوچہ۔ غرضیکہ

طول و عرض ہند کے ہر در و دیوار سے "پاکستان" کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اور اپنوں اور بیگانوں میں سے ہر ایک کو طوعاً و کرہاً تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے جسے آسانی سے رد نہیں کیا جا سکے گا۔ حتیٰ کہ مسٹر ایمرے وزیر ہند کو بھی اکثریت کی قوت سے مغلوبیت کے باوجود، یہ کہے بغیر بن نہ پڑا کہ "ہندوستان کے صوبوں کی جدید تقسیم و ترمیم نہایت ضروری ہو چکی ہے"۔ مسٹر سی۔ آر۔ ریڈی۔ وائس چانسلر اندھرا یونیورسٹی نے دستورِ ہند سے متعلق ایک جدید اسکیم کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جس میں انھوں نے تجویز کیا ہے کہ مرکزی حکومت میں ملک کی نمایندگی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نہ کی جائے۔ بلکہ (مسلمانوں کے ایک مستقل قوم ہونے کی حیثیت سے) پچاس فیصدی نیابت مسلمانوں کو دی جائے۔ خواہ اس کے لئے ہندوستان میں ایک اور صوبہ کا اضافہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اور حکومت، فیڈریشن کے بجائے کانفیڈریشن کے اصول پر متعین کی جائے (اسٹیٹمین مورخہ ۱۲؍۴۳) اچھوتوں کے نمایندہ۔ مسٹر امبیڈکار نے حال ہی میں ایک کتاب بعنوان "نظریۂ پاکستان" شائع کی ہے۔ جس میں انھوں نے اس امر پہ زور دیا ہے کہ پاکستان ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ وہی ہندو جو ابھی کل تک کہتے تھے کہ "ہندوستان میں دو ہی قوتیں ہیں۔ گورنمنٹ اور کانگریس"۔ ان کی طرف سے علانیہ اس امر کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی نمایندہ جماعت مسلم لیگ ہے۔ جس کی قوت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا ابھی اگلے دنوں بمبئی میں اعتدال پسند حضرات کی ایک کانفرنس ہوئی ہے جس میں، ہر شخص نے اس حقیقت پر زور دیا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمایندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہوگا۔ (واضح رہے کہ ان اعتدال پسندوں میں مسلمان کوئی نہیں تھا) خود حکومت ہند کی یہ کیفیت رہی کہ جن جن مسائل میں وائسرائے کو ہندوستان کے نمایندوں سے مشورہ کی ضرورت پڑی۔ مسلمانوں کی نمایندگی کے لئے صدر مسلم لیگ ہی کو دعوت دی گئی۔ کسی اور جماعت کو مسلمانوں کا نمایندہ نہیں سمجھا گیا۔ بہر حال اس سال بھر کے عرصہ میں اتنا کچھ ضرور ہو گیا۔ ممکن ہے آپ کہدیں کہ یہ تو کچھ اطمینان بخش نہیں۔ اس لئے کہ قومیں جس برق رفتاری سے مسابقت کر رہی ہیں۔

زمانہ جس سبک خرامی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ حالات جس سیماب پائی سے بدل رہے ہیں۔ اسکے پیش نظر ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اسمیں شبہ نہیں، اور ہمیں اس سے بالکل اتفاق ہے۔ لیکن دوسری قوموں اور ان قوموں کے کوائف واحوال پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اِس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ ابھی دو برس اُدھر ہندوستان میں آپ کی حالت کیا تھی ؟ : پچھلے سال جس مقام سے آپ چلے ہیں اس مقام پر آپ کی کیفیت کیا تھی ؟ ہندوستان میں آپ کی جداگانہ ہستی تسلیم کرنے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ خود آپ کے اپنے اندر اجتماعی زندگی کا احساس نہ تھا۔ زندگی کا نہ کوئی مقصد سامنے تھا اور نہ اس مقصد کے حصول کی تڑپ مسلمان ساحل دریا پر ریت کے منتشر ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ کہ جو موج اُٹھتی اُنھیں اپنے دامن میں لپیٹ کر لے جاتی۔ جس ہوا کا تیز جھونکا آتا اُنھیں اُڑا کر کہیں کا کہیں پھینک دیتا۔ اور ان خارجی اسباب وعلل پر غور کرنے کے بعد "بازنجو لیش نگر" اپنے آپ سے ذرا یہ بھی تو پوچھیئے کہ سعی وعمل میں میرا کس قدر حصّہ ہے ؟ دوسروں کی جدوجہد کا محاسبہ کرنے سے پہلے اپنی سعی وکاوش کا بھی محاسبہ کیجئے بات سمجھ میں آجائیگی۔ ان حالات کے ماتحت ہمارا خیال ہے کہ اللہ کے ان دوچار مخلص بندوں نے حالات کی اس قدر ناسازگاری۔ مخالفت کے اس ہجوم۔ اپنی قوم کی بے بضاعتی۔ ذرائع واسباب کی قلت بلکہ فقدان کے باوجود جتنا کچھ بھی کر دکھایا ہے وہ مستحق تبریک و درخور سپاس گذاری ہے۔

خاکِ ماخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرّہ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر
اقبالؒ

"مخالفت کے ہجوم کا تذکرہ آگیا۔ تو اس کی کچھ اجمالی تفصیل بھی ضروری نظر آتی ہے۔ **پاکستان** ایک ایسا عزم ہے جس کی ہر طرف سے مخالفت ہونی ضروری تھی۔ باطل کی کونسی قوت ہے جسے حق کی سربلندی خوش آسکتی ہے۔ وہ کونسا شرارِ بولہبی ہے جو چراغ مصطفوی سے ستیزہ کار نہیں رہنا چاہتا۔ وہ کونسا "فرعون" ہے جو موسیٰ کی بڑھتی ہوئی قوت سے متوحش نہیں ہوا؟ وہ کونسی چمگادڑ ہے جو ظہورِ آفتاب سے تلملا نہیں اٹھتی۔ وہ کونسا چور ہے جو اہلِ خانہ کی بیداری پر سر نہیں پیٹ لیتا۔ لہٰذا اس تحریک کی مخالفت غیر متوقع نہ تھی۔ موجودہ سیاسی کشمکش میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی مخالفت خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی کرائی ہے اور یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو اور اس کا تذکرہ کیسا ہی جانگداز لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی پرالم داستان کے بکھرے ہوئے ورق جہاں کہیں بھی ملیں گے۔ بین السطور میں کسی نہ کسی **جعفر** (بنگال) اور کسی نہ کسی **صادق** (دکن) کا نام "واٹر مارک" کی طرح پنہاں نظر آئے گا جو حقیقت کی روشنی کے سامنے آنے پر ابھر کر سطح پر آجائے گا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کی مخالفت اور کن کی طرف سے؟ جمعیت العلماء، مجلس احرار۔ آزاد کانفرنس۔

ننگِ آدم ننگِ دین ننگِ وطن (اقبالؒ)

مخالفت کا سیلاب اٹھا تو اس زور و شور سے۔ لیکن ہندو کی "بنیا بدھی" نے جلد ہی بھانپ لیا کہ سودا خسارے کا ہے ہندو تو بنیادی طور پر **بنیا** ہے۔ وہ یونہی روپیہ ضائع نہیں کرتا۔ اسے جس وقت معلوم ہو جائے کہ تجارت نفع کی نہیں۔ جھٹ ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ آزاد کانفرنس دہلی کا اجتماع۔ تزئین و آرائش کے اعتبار سے بڑا بھڑکیلا تھا لیکن اس کے بعد کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی کہ اس حسین آغاز کا انجام کیا ہوا۔

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

مجلس احرار کا یہ عالم ہے کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اور جمعیت العلماء۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ میرے منہ سے نکل جائے (اقبالؒ)

سال بھر میں یہ کیفیت ہو گئی کہ ان کے نام تک ذہنوں سے اتر گئے۔ سوچئے! کہ حق کی مخالفت۔ اسلامی

حکومت کے قیام کی مخالفت ۔ قوانینِ شریعت کے نفاذ کی مخالفت ۔ مسلمانوں کی سرفرازی و سربلندی کی مخالفت!
بھلا یہ لوگ دنیا میں پنپ سکتے تھے! یریدون لیطفئوا نور اللہ

چراغ را کہ نورِ حق فروزد ۔۔۔ کسے کو پف زند ریشش بسوزد

اُف! کیا عبرت خیز انجام ہے اور کس قدر افسوسناک منظر!

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔ ان کی سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

لیکن یہ سب مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہو رہی تھی جو لیگ سے باہر کھڑے تھے ان کے متعلق علم ہی تھا کہ وہ مخالفت کریں گے ۔ اس مخالفت کا نہ کوئی گلہ ہے نہ افسوس ۔ سب سے زیادہ رنج دہ وہ مخالفت ہے جو لیگ کے اندر رہ کر لیگ کا نقاب اوڑھ کر ۔ ہمدرد اور مشفق بن کر ۔ آنکھوں میں آنسو اور آستین میں خنجر لے کر کی گئی ۔ تحریک پاکستان کے متعلق کھٹکا تھا کہ شاید مسلم اقلیت کے صوبوں سے اس کی مخالفت ہوگی لیکن جس خندہ پیشانی اور وسیع القلبی سے ان صوبوں کے نمائندوں نے اس کی تائید و حمایت کی، وہ ان کے اخلاص اور جذبۂ اسلام دوستی کی درخشندہ مثال تھی بمبئی سے تائید ہوئی ۔ مدراس سے تائید ہوئی ۔ سی ۔ پی ۔ یو ۔ پی ۔ بہار والوں نے بڑھ چڑھ کر حمایت کی لیکن اس کی مخالفت ہوئی تو کہاں سے؟ پاکستان کی مرکز پنجاب سے! خدا کی شان ؎

حسن ز بصرہ ۔ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است ۔

سر سکندر حیات خاں صاحب نے اس تحریک کی مخالفت کی پہلی اینٹ اجلاس لاہور سے بھی پہلے رکھدی تھی ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ شروع مارچ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے جلسۂ تقسیم انعامات میں طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ۔

"زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی کیوں نہ ہو ۔ لیکن یاد رکھو تم نے کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشاء یہ ہو کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کر لیا جائے یہ اسکیم نہ صرف اسلامی تعلیم کی صحیح رُوح کے ہی خلاف ہے بلکہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے بھی منافی ہے جس کی رو سے ہر فرزند توحید پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام

دنیا کے ہر گوشہ تک پہونچا دے" (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۳/۴۰ء)

اس ناصحِ مشفق ۔ ہمدردِ اسلام ۔ طلبا کے غمگسار کی اس نصیحت کا کیا اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ٹھیک ایک سال بعد ۔ عین انہی تاریخوں میں ۔ اس اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں تمام پنجاب کے مسلم طالب علموں نے اپنی فیڈریشن کا خاص "پاکستان سیشن" منعقد کیا ۔ جس میں جناب سر سکندر کی مشفقانہ نصیحت کے علی الرغم نہایت دھڑلے سے پاکستان کی تائید میں تقاریر کی گئیں اور ریزولیشن پاس ہوئے ۔ سر سکندر کو فیڈریشن کے اس اجلاس میں سامنے آنے کی بھی جرأت نہ ہو سکی ۔

انہی دنوں (یعنی سال گذشتہ) سر سکندر کے نفسِ ناطقہ ۔ سر چھوٹو رام صاحب نے سونی پت کی جاٹ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ **سکندر تحریکِ پاکستان کے مخالف ہیں اور**

"وہ کسی خالص اسلامی حکومت میں وزیرِ اعظم بننا تو در کنار کوئی ذمہ داری کا عہدہ تک لینے کو تیار نہ ہوں گے" (طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۴۰ء)

یہ سال گذشتہ کی بات تھی ۔ ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے **سر سکندر حیات خاں** صاحب نے ارشاد فرمایا ۔

اگر پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ پنجاب میں خالص اسلامی راج ہوگا تو مجھے اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا" (ہندوستان ٹائمز ۱۲-۳/۴۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے ! لفظاً بہ لفظ وہی کچھ جو ایک سال پہلے نفسِ ناطقہ" صاحب نے فرمایا تھا ۔ ان الفاظ پر پھر غور فرمائیے کہ "اگر پنجاب میں خالص اسلامی حکومت قائم ہوئی تو مجھے اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا" یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے نکل رہے ہیں جسے مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کا دعوےٰ ہے ۔ جو اپنی موجودہ پوزیشن پر محض اس لئے سرفراز ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان بتاتا ہے ۔ مسلمان ! اور اسلامی حکومت سے اس قدر نفرت اور بیزاری !

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ لیگ کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس کلکتہ میں ہو یا بمبئی میں ۔ مدراس میں ہو یا پونہ میں ۔ سر سکندر حیات خاں صاحب نہایت التزام و اہتمام سے اس میں شرکت کے لئے تشریف لیجاتے ہیں خواہ اس سے ان کے دیگر مشاغل میں کتنا ہی حرج کیوں نہ واقع ہوتا ہو ۔ آپ ستمبر ۱۹۴۰ء میں بمبئی میں مجلسِ عاملہ کے

اجلاس میں بھی تشریف لے گئے ۔ وہاں پاکستان اسکیم کی تائید میں ریزولیوشن پاس ہوا ۔ واپسی پر ٹریبون کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے آپ نے فرمایا ۔

میں آج بھی ہندوستان کی تقسیم کا مخالف ہوں اور میرا ابھی تک یہی عقیدہ ہے کہ فرقہ وار بنیادوں پر ملک کی تقسیم ہرگز ہرگز نہیں ہونی چاہئیے مثلاً پنجاب میں نہ کسی ایک فرقہ کی حکومت ہوسکتی ہے ۔ نہ ہونی چاہئیے ۔ یہاں صرف پنجابیوں کی حکومت ہونی چاہئیے ۔

(ہندوستان ٹائمز ۹/۴ ۱۲)

فروری ۱۹۴۲ء میں انبالہ میں "آل انڈیا جاٹ مہا سبھا" کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے نفس ناطقہ (جناب سر چھوٹو رام صاحب) نے فرمایا ۔

"جو لوگ مسلم راج ۔ ہندو راج یا سکھ راج کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ "احمقوں کی جنت" میں رہتے ہیں ۔ اس کرۂ ارض پر کوئی ایسی قوت موجود نہیں جو ہندوستان کو فرقہ وارانہ منطقوں میں تقسیم کر دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں چاہئیے کہ اپنے مذہب کو مساجد ۔ مندر اور گوردواروں کی چار دیواری میں محبوس کر چھوڑیں ۔" (ہندوستان ٹائمز ۲/۱۴ ۴۲)

اب پھر سکندر حیات خاں صاحب کی باری تھی ۔ چنانچہ میلہ بسنت کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ۔

"پاکستان ۔ خالصتان اور اسی قسم کی دوسری تحریکات قابل مذمت ہیں اور پنجاب میں صرف پنجابیوں کی حکومت ہو سکتی ہے ۔" (زمزم ۔ بحوالہ نقیب ۲/۴۱ ۱۷)

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں سر سکندر حیات خاں صاحب یہ سب کچھ محض اس لئے کر رہے ہیں کہ کسی طرح ہندو اور سکھ ان سے راضی رہیں اور اس طرح ان کی وزارت کی گدی قائم رہے لیکن وہ اپنے اس نقاب پوشانہ طرز عمل سے ہندوؤں کو کس قدر خوش رکھ سکتے ہیں اس کا زندہ ثبوت اس بے پناہ تنقیدی نشتر سے لگ سکتا ہے جو اس تقریر کے دوسرے ہی دن ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوئی : تنقید کیا تھی ۔ جناب سر سکندر کی بے نقاب تصویر تھی ۔ ایک کارٹون تھا جس میں سر سکندر کو مرغ بادنما کی شکل میں دکھایا گیا تھا ایک طرف درخت پر مسٹر جناح بیٹھے اور دوسری طرف سر چھوٹو رام ۔ دونوں زور زور سے پھونکیں مار رہے تھے جس کی پھونک زیادہ زوردار ہو جاتی یہ مرغ بادنما اسی کے مطابق اپنا رخ بدل لیتے

ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف "اتحادی حکومت" کے راستے دکھا رکھے تھے - اور اوپر لکھا تھا

Weather Cock

کہئیے! کیا سر سکندر حیات خاں صاحب کی روش زندگی پر اس سے بہتر تنقید اور قرآن کریم کے اس آیۂ جلیلہ کی عمدہ تشریح اور بھی ہوسکتی ہے -

اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَھُمُ الۡعِزَّۃَ (۴/۱۳۹ و ۸/۶۳)

یہ لوگ ان (غیروں) کے ہاں عزت تلاش کرنے جاتے ہیں - کہئیے کہ عزت تو تمام اللہ، اس کے رسول اور جماعت مومنین کے ساتھ رہنے میں ہے -

سر سکندر حیات خاں صاحب کی ان طفلانہ حرکات سے لیگ کے ارباب حل وعقد ایک عرصہ سے تنگ آچکے تھے وہ کب تک اس "تبسم بہ لب خنجر بہ آستین" مسلک کو برداشت کرتے جاتے - چنانچہ ۲۳ فروری ۱۹۴۱ء کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آگیا - اخبارات میں اس کے متعلق جو کچھ شائع ہوا اس کا ملخص یہ ہے کہ جب سر سکندر حیات خاں سے کہا گیا کہ آپ آئے دن علیحدگی کی اسکیم کی مخالفت کیوں کرتے رہتے ہیں تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں لیگ کی اسکیم کی مخالفت تھوڑے کرتا ہوں میں تو "پاکستان" کے لفظ کی مخالفت کرتا ہوں - آپنے کہا " میں نے تو خود لاہور ریزولیشن کا مسودہ تیار کیا تھا - اس لئے میں تو اس اسکیم کے فریق جانبدار کی حیثیت رکھتا ہوں بھلا میں کیسے اس کی مخالفت کرسکتا ہوں " سنیئے کہ مسٹر جناح نے کیا کہا - آپنے فرمایا! سر سکندر صاحب! آپنے پاکستان کی مخالفت تو بیس مرتبہ کردی لیکن کبھی ایک مرتبہ " لاہور ریزولیشن " کی تائید بھی کی ہے؟ لاہور ریزولیشن کی تائید کے بغیر پاکستان کی مخالفت میرے خیال میں - دیانتدارانہ مسلک نہیں ہے " مجلس عاملہ کے بعض اراکین نے دوران بحث میں یہ بھی کہا کہ " اگر لاہور کے ریزولیشن سے مراد یہ نہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں اسلامی حکومت کا قیام ہوگا - تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس ریزولیشن کا مفہوم خاک بھی نہیں - اور اسی کا نام پاکستان ہے - لہذا پاکستان کے لفظ سے گھبرانا کیسا! (ملاحظہ ہو ہندوستان ٹائمز ۲۴-۲-۴۱)

یہ جھڑپ ۲۲ فروری کو ہوئی - شروع مارچ میں مسٹر جناح طلباء کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لے گئے - وہاں انہوں نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ لیگ کی اسکیم کی وضاحت فرمائی - اور غیر مبہم الفاظ میں بتایا کہ مذبذبین کو چاہیئے کہ اپنی روش کے متعلق بہت جلد دو ٹوک فیصلہ کرلیں

انقلاب مورخہ ۵ ۳/۴۴ میں تحریر ہے -

"مسٹر جناح نے ان مسلمانوں کو جو ابھی تک پاکستان کے متعلق مذبذب ہیں زبردست تنبیہ کی اور کہا کہ " وہ مسلمان جو ابھی تک مذبذب ہیں اور جن کی روش تنزلزل ہے انہیں فوراً دوٹوک فیصلہ کرنا چاہیئے کہ انہیں کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے - انہیں فوراً کسی نہ کسی طرف ہوجانا چاہیئے "

سر سکندر حیات خاں نے مجلس عاملہ کے اجلاس میں لفظ " پاکستان " کی آڑ لے کر اپنی روش کی مدافعت کی ناکام کوشش کی تھی - مسٹر جناح نے فرمایا -

" پاکستان کا مطلب ہر عقلمند خوب جانتا ہے - کوئی شخص شیطنت یا شرارت کا مظاہرہ کرے تو اسے خدا ہی سمجھے گا - میرے بس کا روگ نہیں - لیکن جب ہم پاکستان کہتے ہیں تو ہماری مراد قرارداد لاہور ہوتی ہے " (انقلاب ۴ ۳/۴۴)

سر سکندر حیات خاں صاحب کی نقاب اب اس قدر تار تار ہو چکی تھی کہ اپنے تو ایک طرف، بیگانے بھی قسم و یقین کے ساتھ کہنے لگ گئے کہ اب واضح ہو گیا کہ سر سکندر لیگ کے ساتھ نہیں ہیں - چنانچہ جن دنوں لاہور میں " پاکستان کانفرنس " کے اجلاس ہو رہے تھے - مقابلہ میں ہندوؤں کی طرف سے " اینٹی پاکستان کانفرنس " بھی منعقد ہوئی تھی - اس کے صدر ڈاکٹر مکر جی نے اپنی تقریر میں کہا -

مسلمانوں کے ایک حلقہ کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ہندوستان کی گتھی کبھی سلجھ نہیں سکتی جب تک کہ مسٹر جناح کی پاکستان کی اسکیم کو تسلیم نہ کر لیا جائے - مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پنجاب کے وزیر اعظم ان مسلمانوں میں سے نہیں ہیں (ہندوستان ٹائمز ۲ ۳/۴۴)

ڈاکٹر مکر جی نے یہ غلط نہیں کہا - چنانچہ ادھر مسٹر جناح نے لاہور سے منہ موڑا اور ادھر سر سکندر حیات خاں صاحب نے ۷ مارچ کو پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا -

" میں پنجابیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ پاکستان - ہندو راجستان یا خالصتان کی باتیں نہ کریں بلکہ اپنے تمام اختلافات مٹا کر ساری دنیا پر واضح کر دیں کہ پنجاب نہ صرف پنجاب کا ہی نجات دہندہ ہے بلکہ باقی ہندوستان کا بھی " (ہندوستان ٹائمز ۹ ۳/۴۴)

گویا اب سر سکندر حیات خاں صاحب بھی ذرا اور کھل کر میدان میں آئے اور تمام اہل پنجاب کو اس

تحریک پاکستان کی مخالفت پر ابھارا جس کا مرکز پنجاب بننے والا ہے، اور ابھارا اس پرانے جاہلی جذبہ عصبیت وطن کی بناء پر "پنجاب پنجابیوں کے لئے" "پنجاب سارے ہندوستان کا نجات دہندہ" یوں زمین تیار کر لینے کے بعد ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو وہ نقاب اتار کر مسٹر جناح کے مقابلہ میں آ گئے اور وہ منصوبہ جو ایک عرصہ سے ان کے سینہ کو جھنجھوڑ رہا تھا لیکن کھلے کھلے الفاظ میں لب تک نہ آتا تھا۔ اب نتھر کر سطح پر آ گیا۔ آپ نے فرمایا۔

> اگر پاکستان سے یہ مفہوم ہے کہ پنجاب میں خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ تو میرا ایسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے میں باہر والوں کے مشورہ کو سننے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اس مشورہ کو ماننا یا مسترد کر دینا یہ میری مرضی پر موقوف ہے جس طرح مہاتما گاندھی چاہتے ہیں کہ وہ خود مختار رہیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ چاہتی ہے کہ وہ بھی خود مختار رہیں اسی طرح ہم بھی یہی چاہتے ہیں ہمیں اس سے کیوں محروم رکھا جائے (اس میں شبہ نہیں کہ) ہر شخص کو آزادی کا حق ہے لیکن دوسروں کو مغلوب کر لینے کی آزادی نہیں۔ میں ہر شخص کو علانیہ کہدینا چاہتا ہوں۔ کسے باشد کہ "پنجاب سے ہاتھ دھو رکھو"
>
> (ہندوستان ٹائمز ۱۲ ۳/۴۱)

غور فرمایا آپ نے! اس تقریر کا ایک ایک لفظ لیگ اور مسٹر جناح کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ مسٹر جناح۔ "باہر والے ہیں"۔ انہیں پنجاب کے معاملات میں صرف مشورہ دینے کا حق حاصل ہے۔ اس کا ماننا نہ ماننا سر سکندر حیات خاں صاحب کی مرضی پر موقوف ہے۔ سر سکندر پنجاب کے معاملات میں لیگ اور مسٹر جناح سے اسی طرح خود مختار رہنا چاہتے ہیں جس طرح مسلم لیگ گاندھی جی اور کانگریس کے اثرات سے خود مختار رہنا چاہتی ہے۔ یا جس طرح گاندھی جی اور کانگریس۔ لیگ یا دیگر اثرات سے۔ یعنی جس طرح لیگ کو کانگریس سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح سر سکندر کو بھی لیگ سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ مسٹر جناح یا لیگ کی آزادی کو اس حد تک دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ان کی اپنی آزادی میں فرق نہ آئے۔ اور اس کے بعد دھمکی دیتے ہیں کہ تم پنجاب کو پاکستان کا مرکز بنانا چاہتے ہو؟ ذرا ادھر قدم رکھکر تو دیکھو۔ تم ہوتے کون ہو؟

یہ ہیں سر سکندر حیات خاں صاحب اپنے اصلی رنگ میں! وہ رنگ جسے دیکھنے والی آنکھوں نے ایک

مدت پہلے سے دیکھ رکھا تھا۔ لیکن جس نے بہت سے سادہ لوحوں کو ایک عرصہ تک فریب میں مبتلا رکھا۔ ہمیں ان کی مخالفت سے کوئی گلہ نہیں۔ قومیت پرست مسلمانوں نے مخالفت میں اپنا پورا زور لگایا۔ جب ان کی مخالفت سے ہمیں کوئی رنج نہیں ہوا تو سرسکندر کی مخالفت سے کیا شکوہ ہو سکتا ہے۔ شکوہ ہے سرسکندر حیات خاں کی

منکرے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن

کی افسوسناک روش سے۔ اگر انہیں لیگ کی اسکیم سے اس قدر مخالفت ہے اگر وہ پنجاب میں خالص اسلامی حکومت کے قیام کے تصور سے بھی پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ اگر وہ صدر مسلم لیگ کے فیصلوں کی اتباع میں اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اگر وہ مسلمانوں کی جماعت سے ملنے میں اپنے ہندو اور سکھ رفقائے کار کی ناراضگی سے خائف ہیں۔ اگر وہ "پنجابی" کے بجائے مسلمان بننے میں اپنے ایوانِ وجاہت میں لرزش محسوس کرتے ہیں۔ تو انہیں کس چیز نے مجبور کر رکھا ہے کہ وہ لیگ سے علیحدہ نہ ہو جائیں وہ لیگ سے قطع تعلق کریں اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ لیگ کی مخالفت کریں مسلمانوں کو ان پر کوئی گلہ نہ ہوگا لیکن ان کی یہ روش کہ لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن بھی ہیں اور اس لیگ کی مخالفت اپنا نصب العین زندگی بنائے ہوئے ہیں۔ ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ لاہور ریزولیشن کا مسودہ تو خود میرا بنایا ہوا ہے۔ بھلا میں اس کا کیسے مخالف ہو سکتا ہوں" اور لاہور اسمبلی میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ لاہور ریزولیشن کا اصل مسودہ تو میرا ہی تھا لیکن جو ریزولیشن پاس ہوا ہے وہ میرا نہیں۔" (ہندوستان ٹائمز ۱۲ مارچ)

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ کی "اتحادی جماعت" کا کوئی رکن اس قسم کی حرکات کرے۔ تو آپ اس کے متعلق کیا کہیں گے؟ اور اگر آپ کو یہ علم نہ ہو کہ آپ کیا کریں گے تو کسی وقت بھیس بدل کر باہر نہیں۔ خود پنجاب کے مسلمانوں میں چلئے پھرئے اور اپنے کانوں سے سنئے کہ آپ کے متعلق کیا کہا جاتا ہے۔ اور پھر سوچئے کہ کیا یہ روش اس قابل ہے کہ اس پر نازاں ہوا جائے۔ لیگ سے استعفا دیجئے اور جو جی میں آئے کیجئے۔ کوئی آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو اس سے ناآشنا رہے ہیں۔

لیکن ہمیں سرسکندر حیات خاں صاحب سے کہیں زیادہ گلہ خود مسلم لیگ پر ہے۔ انہیں اس سے

اتفاق ہے کہ اصلاح حال کے لئے مہلت دینا نہایت ضروری ہے۔ یہ بھی ہمیں تسلیم ہے کہ توڑنے سے پیشتر جوڑنے کی ہر ممکن کوشش درخور تحسین ہے، لیکن مہلت اور اصلاح کی کوشش کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ متورم انگلی کا حتی الامکان علاج کرنا چاہیئے لیکن جب حالت یہاں تک پہونچ جائے کہ اس کا زہر سارے جسم میں پھیل رہا ہو تو ایسی زہر آلود انگلی جتنی جلد کاٹ کر پھینک دی جائے۔ اتنا ہی بہتر ہے کیا لیگ کو معلوم ہے کہ اس کی اس ضرورت سے زیادہ خاموشی کیا اثر پیدا کر رہی ہے؟ پاکستان کے متعلق پنجاب سے مخالفت کی آواز لیگ کی تمام کوششوں پر پانی پھیرے جا رہی ہے۔ اور جب مخالفین کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس مسئلہ پر تو لیگ والوں کے اپنے اندر سخت اختلاف موجود ہے۔ دیکھئے سر سکندر لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن بھی ہیں اور پاکستان کا لفظ تک سننا نہیں چاہتے۔ تو اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا عوام الناس اس سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ قوم کا نوجوان طبقہ بد دل ہو رہا ہے بیگانے ہنستے ہیں یگانے روتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اب مزید توقف کی ضرورت نہیں۔ اب پانی سر سے گذر گیا اب لیگ کو اپنی پوزیشن صاف کر دینی چاہیئے۔ ذرا سوچئے تو سہی! سر سکندر حیات خاں صاحب اسمبلی میں وہ تقریر فرما رہے ہیں جس کے اقتباسات اوپر درج کئے جا چکے ہیں۔ وہ تقریر جو لیگ اور ارباب لیگ کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ واضح الفاظ میں اعلان جنگ ہے اور اس تقریر کے بعد جونہی وہ بیٹھتے ہیں پنجاب مسلم لیگ کے صدر جناب نواب شاہنواز خاں صاحب اٹھتے ہیں اور سر سکندر حیات خاں صاحب کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے لاہور ریزولیشن کی نہایت عمدہ وضاحت فرمائی ہے" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○ سنیئے اس مبارک باد کا جواب کیا ملا۔ سر سکندر نے کہا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اگر وہ لاہور ریزولیشن کی وضاحت ہے۔ تو

> " مجھے امید ہے کہ میرے دوست (سر شاہنواز خاں صاحب) لاہور ریزولیشن کی (اس وضاحت کے مطابق) ترمیم کریں گے" (ہندوستان ٹائمز ۱۲-۳-۴۱)

آپنے سمجھا بھی یہ کیا ہوا! سر شاہنواز خاں صاحب نے فرمایا کہ سر سکندر نے لاہور ریزولیشن کا مفہوم خوب اچھی طرح سے بیان فرمایا ہے۔ اور انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم لاہور ریزولیشن یہی سمجھتے ہو جو میں نے کہا ہے تو لاہور ریزولیشن میں ترمیم کراؤ۔ ہم حیران ہیں کہ نواب سر شاہنواز خاں صاحب کی اس حرکت کے متعلق کیا لکھیں۔ وہ حرکت جس پر ان کی ذمہ داری کانپتی ہے۔ بصیرت روتی ہے۔ اور

دنیا ہنستی ہے۔ یا تو وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ سر سکندر نے کیا کہا ہے اور یا انہیں اُن کی اس درجہ خوشامد منظور تھی۔ ناسمجھی ہو یا خوشامد۔ بہرحال بات تو وہیں رہتی ہے کہ لیگ کی موجودہ روش سے اس کی پوزیشن عجیب سی ہو رہی ہے۔ جتنا جلد اس پوزیشن کو واضح کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

قبل اس کے کہ لیگ اس باب میں آخری قدم اٹھائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر اپنے راہ گم کردہ۔ فریب خوردہ۔ بھائی۔ سر سکندر حیات خاں صاحب کی خدمت میں کچھ مخلصانہ گذارش کر دیں اس گذارش کا محرک جذبہ صرف وہ اخوت و ہمدردی ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے ہونی چاہیئے۔ ہم سر سکندر کی موجودہ روش کو قوم کے لئے اور خود ان کیلئے ہلاکت کا موجب سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ جہاں ہم نے قوم کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ سر سکندر کو بھی ان کے مسلک کے عواقب سے آگاہ کر دیں کہ ممکن ہے۔ اس سے ان کے سینہ کے اندر کوئی دبی ہوئی چنگاری (اگر وہ موجود ہے تو) ان کی حرارتِ قلب کا باعث بن جائے۔

کہ ہم نے انقلاب چرخ دوراں یوں بھی دیکھا ہے

ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک زندگی اس دنیا کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ بلکہ اصل زندگی تو شروع ہی اس کے بعد ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں اس دنیا کے مقاصد و مصالح کو سامنے رکھنا ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے (بلکہ اشد ضروری) کہ دیکھا جائے کہ ان مقاصد و مصالح کی تگ و دو میں آیندہ زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اصل زندگی جماعت کے ساتھ جینے اور جماعت کے ساتھ مرنے میں ہے وجاہت طلبی کا جذبہ کوئی بری چیز نہیں۔ عزت و شوکت کی آرزو کوئی مذموم آرزو نہیں۔ لیکن وہ وجاہت جو غیروں کی رضا جوئی سے حاصل ہو وہ عزت و شوکت جو دوسروں کی قوت کی رہین کرم ہو۔ ظاہری طور پر وجاہت و عزت سمجھی جائے تو اور بات ہے۔ فی الحقیقت وجاہت و عزت نہیں۔ بلکہ انتہائی ذلت و مسکنت ہے ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

نہ وہ دل کا اضطراب، وہ عدم سکون۔ وہ فقدانِ طمانیت۔ وہ خلش و کاوش۔ جو دوسروں کو ساتھ رکھنے

کی خاطر آپ دَرِ حرکت سے بے اختیار ابل پڑتی ہے۔ اس "عقوبت دوزخ" کی صاف صاف غمازی کرتی ہے جس کی طرف سعدیؒ نے اشارہ کیا ہے۔ آپ کو یہ چیزیں نظر نہیں آسکتیں کہ اپنے مقاصد کے حصول کی دھن میں انسان اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کا ذہن اس طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ آپ کے گرد و پیش بھی کوئی ایسا سچا ہمدرد نہیں جو آپ کو ان چیزوں سے آگاہ کرے۔ بلکہ وہ آپ کے ہر عمل کی تائید میں ہی اپنی مصلحت سمجھتے ہیں لیکن یقین مانیئے۔ ہمارے دل میں آپ کے لئے اسلامی اخوت کا سچا جذبہ موجود ہے۔ اور اسی کی بنا پر ہم آپ سے یہ گذارش کر رہے ہیں کہ عزت وہی عزت ہے جو اپنوں میں رہ کر حاصل ہو۔ وجاہت وہی وجاہت ہے جو غیروں کے سہارے کی مرہون نہ ہو۔

در جہاں بال و پر خویش کشودن آموز — کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دگراں

آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز — آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں — اقبالؒ

آپنے دوسروں کے خزف ریزوں کو اس لئے اہمیت دے رکھی ہے کہ آپ کو اپنے ہاں کے خزائن و دفائن کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ نہیں! بلکہ خود ان نگاہوں کی قیمت کا اندازہ نہیں ہے جن سے ان خزف ریزوں میں یاقوت و الماس کی چمک پیدا ہو رہی ہے۔

تو قدر خویش ندانی بہا ز تو گیرد

وگرنہ لعل درخشندہ پارۂ سنگ است — (اقبالؒ)

آپ کو دوسروں کی قوت اس لئے مرعوب کر رہی ہے کہ آپ اپنوں کی قوت سے لذت آشنا نہیں ہیں۔ اور جنھیں آپ اپنا سمجھ رہے ہیں۔ وہ خود اتنے کمزور ہیں کہ جنازے کی طرح دوسروں کے کندھے پر لدے لدے جانے پر مجبور ہیں۔ ورنہ اگر آپ اپنی "جماعت" کے ساتھ رہنے کی قوت سے آشنا ہو جائیں اور اس طرح آپ کو اپنی قوت کا اندازہ لگ جائے تو دیکھیئے کہ دنیا کی کوئی قوت آپ کی نگاہوں میں قوت ہی نہ رہے۔

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ

اے بندۂ مومن تو بشیری تو بشیری — (اقبالؒ)

آپ کے سامنے صرف عاجلہ مقاصد اور پیش پا افتادہ مصالح ہیں۔ ذرا دامنِ نگاہ میں وسعت پیدا کیجیئے اور دیکھیئے کہ اگر آپ اپنوں کے ساتھ ہو کر اپنی قیمت اور قوت کو صحیح پیمانے پر لے آئیں۔

تو کس قدر محکم عزت اور کیسی مستقل وجاہت آپ کے پاؤں چومتی ہے۔ یہ وزارت اور اس کی شوکت آرائیاں شے ہی کیا ہیں! اس وقت وہ عزت اور شوکت حاصل ہوگی کہ دنیا تو ایک طرف آپ خود متعجب ہو جائیں گے ذرا سوچیے تو سہی کہ اس وقت صرف آپ سربلندی کے مقام پر ہیں۔ کیا اس سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ساری کی ساری ملت اسلامیہ سرفرازی و سربلندی کے مقام پر جلوہ ریز ہو۔ اس وقت آپ کو صرف اس دنیا کی متاع حاصل ہے۔ کیا اس سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ دین و دنیا کی کامرانیاں اور شادکامیاں آپ کے حصہ میں آجائیں؟ اس وقت آپ اپنی موجودہ حکومت کے بل بوتے پر لوگوں کے سر طوعاً و کرہاً اپنے سامنے جھکوا لیتے ہیں۔ کیا اس سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ لوگوں کے دل آپ کی طرف بطیب خاطر جھکتے چلے جائیں؟ اس وقت آپ خاص اہتمام سے لوگوں کو اپنی باتیں سنانے کے لئے جمع کرتے ہیں۔ کیا یہ زیادہ ٹھیک نہ ہوگا۔ کہ لوگ خنداں و فرحاں خود بخود پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہوا کریں اور آپ کی خاطر دیدہ و دل فرش راہ کریں؟ اس وقت آپ ہر فیصلہ کے موقع پر غیروں کے ہاتھوں کی طرف تکتے ہیں کہ وہ کدھر اٹھ رہے ہیں۔ کیا اس کی بجائے یہ ٹھیک نہ ہوگا۔ کہ ہر فیصلہ کے موقع پر غیروں کی آنکھیں آپ کے ہاتھ کی جنبش کی طرف لگ رہی ہوں؟ اس وقت آپ پنجاب۔ پنجابیوں کے لئے کہتے ہیں۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ آپ اس کی بجائے یہ کہیں کہ اللہ کی زمین اللہ کے صالح بندوں کے لئے ہے؟ اس وقت صرف آپ کا حکم نافذ ہوتا ہے کیا یہ زیادہ شاندار نہ ہوگا کہ اس کی بجائے آپ کے اللہ کا حکم نافذ ہو جائے۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ دوسری شکل پہلی شکل سے بہتر ہے تو پھر کونسی چیز مانع ہے کہ آپ "بہتر" کو حاصل نہ کریں۔ اس کے لئے کچھ زیادہ محنت درکار نہیں۔ کچھ لمبی چوڑی قربانی کی ضرورت نہیں۔ فقط اخلاص کی ضرورت ہے اس راز کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ملت کے ساتھ رہنے میں ہی اصل زندگی ہے اس حقیقت کو پا لینے کی ضرورت ہے کہ امیر ملت کی اطاعت۔ بے غل و غش اطاعت میں ہی اصل سرفرازی ہے۔ اگر آپ اس راز کو سمجھ لیں تو آپ سب کچھ بن سکتے ہیں۔ سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ اس میں تو دیر ہی کچھ نہیں لگے گی۔

دگر بشاخ گل آویز و آب و نم درکش
پریدہ رنگ ز باد صبا چہ مے جوئی! — اقبالؒ

جناح بھی ایسے ہی جناح بنا ہے۔ اور جو بھی جناح بننا چاہے اسے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ ذرا اپنوں سے مل کر

دیکھئے۔ ملت اسلامیہ تو آپ کو اپنی آنکھوں کا تارا بنائے گی۔ خدا کرے کہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے کہ اس کے سمجھ میں آجانے میں ہی آپ کی اور ملتِ اسلامیہ کی خوش بختی کا راز پوشیدہ ہے۔ وَفِیھَا بَصَائِرُ لِلنَّاس وَآیَاتٌ لِقَوْمٍ یَعْقِلُوْن

لیکن اگر اس کے باوجود سر سکندر حیات خانصاحب اپنے ذاتی اور عاجلہ مصالح کو ہی مقصد زندگی سمجھتے ہیں تو ہم انہیں مجبور تھوڑا کر سکتے ہیں کہ ملت کے مفاد کو اس مقصد پر ترجیح دیں۔ وہ اپنی روش کے آپ مالک ہیں لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ وہ اس صورت میں دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کے مسلک کو تو چھوڑ دیں وہ لیگ سے الگ ہو جائیں اور پھر جس طرح اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ بڑے شوق سے ایسی بلکہ اس سے بھی زیادہ مخالفت کریں۔ یہ مخالفت جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ کسی فرد کی مخالفت نہیں۔ کسی ادارہ کی مخالفت نہیں۔ بلکہ مخالفت ہے۔ حق و صداقت کی آواز کی اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت کی۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی قوت حق و صداقت کی آواز کی مخالفت میں کامیاب ہو جائے۔ باطل کا مٹنا اٹل ہے۔ فرق صرف مہلت کے وقفہ میں ہے۔ کسی کو کم ملتا ہے کسی کو زیادہ۔ لیکن انجام بہر حال سب کا یکساں ہوتا ہے۔ بلکہ جسے مہلت کا عرصہ زیادہ لمبا ملتا ہے۔ اس کا انجام بھی زیادہ عبرتناک ہوا کرتا ہے۔ مبارک ہیں وہ جو اس مہلت کے وقفہ میں اپنی اصلاح کر لیں اور یوں اس آنے والے رسوا کُن عذاب سے اپنے آپ کو بچا لیں کہ جب وہ وقتِ معینہ آپہنچتا ہے تو پھر اسے کوئی قوت ٹال نہیں سکتی۔

مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں دو سرا ریزولیشن خاکساروں سے متعلق پاس کیا تھا۔ اس باب میں ہمیں نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لیگ نے اپنے تغافل سے کوئی عمدہ مثال پیش نہیں کی۔ ہم نے اس زمانہ میں لکھا تھا (لمعات طلوع اسلام بابت اپریل سنہ ۱۹۴۰ء) کہ لیگ کو چاہئے تھا کہ ۱۹ مارچ کے قیامت خیز حادثہ کے متعلق آزاد تحقیقاتی کمیٹی متعین کی جاتی لیکن اپنی کمیٹی متعین کرتا تو ایک طرف۔ اس کمیٹی کی رپورٹ بھی آج تک روشنی نہ دیکھ سکی۔ جو حکومت پنجاب کی طرف سے متعین ہوئی تھی۔ علاوہ بریں اس ایک سال کے عرصہ میں خاکساروں کے خلاف اور جو کچھ ہوا ہم اس حدیث الم کے اعادہ سے ساری محفل کو از سر نو سوگوار نہیں بنانا چاہتے۔ افسوس یہ ہے کہ خاکساروں کا مسئلہ ان کا ذاتی مسئلہ سمجھا گیا۔ مسلمانوں کا

عمومی مسئلہ نہیں سمجھا گیا۔ جیسا کہ اس سے پیشتر بھی لکھا جا چکا ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ خاکساروں نے تشدد برتنے میں غلطی کی۔ اور بھی کئی ایک مقامات پر ان سے غلطیاں ہوئیں لیکن انہیں جس قدر ان غلطیوں کی سزا دی گئی وہ گناہگار کی سزا نہیں "کافر" کی سزا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ اب ہر ایک کو معلوم ہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ وہ قوت خاکساروں کی شکل میں ہو جن سے یہ غلطیاں ہوئیں یا مسلم لیگ کی شکل میں جس نے ابھی تک کوئی ایسی غلطی نہیں کی۔ مسلمانوں کی اجتماعی قوت بہر حال ان کے لئے لرزہ انگیز ہے۔ اور وہ اس قوت کی پریشانی کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مسلم لیگ اگر مشفقانہ انداز و تدبر سے خاکساروں کی حفاظت کر لیتی تو اس سے مسلمانوں کی بہت بڑی قوت محفوظ ہو جاتی۔ ہمیں یقین ہے کہ خاکسار مٹ نہیں سکتے۔ "خاکسار" بیلچہ۔ وردی۔ پریڈ۔ کیمپ چپ راست کا نام نہیں یہ تو خاکساریت کے ظواہر ہیں۔ "خاکسار نام ہے ایک ایسی انقلابی روح کا جو مسلمانوں کی بازآفرینی کے لئے سب کچھ قربان کر دینے پر تیار ہو اور یہ ظاہر ہے کہ ظواہر کے مٹا دینے سے آپ روح کو فنا نہیں کر سکتے خاکساروں کی جمعیت آج منتشر ہے۔ پریشان ہے کس مپرسی کے عالم میں ہے۔ لیکن خاکسار کی روح آج بھی اسی حرارت سے دمکتی ہے جس سے وہ سال بھر پیشتر شعلہ بداماں تھی۔ ایک خاکسار کے متعلق اگلے دنوں معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی قید کاٹ کر آیا ہے بالکل ان پڑھ۔ مزدوری پیشہ۔ جیل خانے سے واپس آیا تو پھر وہی بیلچہ اور پھر وہی جذبہ۔ پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے کہنے لگا کہ ادھر ادھر کا حساب چکا رہا ہوں اس سے فارغ ہو جاؤں تو ویلور جانے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے ابھی تک اپنے امیر کو دیکھا نہیں انکی زیارت ہو جائے تو پھر جیسا وہاں سے حکم ملے۔ یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں۔ سننے والے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا کہ تمہاری قربانیوں کی کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ تم جان تک اللہ کے راستے میں دے رہے ہو۔ سنئے کہ اس کے جواب میں اس ان پڑھ مزدور نے کیا کہا۔ جواب دیا کہ حیرت ہے کہ تم جان دینے کو اس قدر اہمیت دے رہے ہو۔ جان تو بہر حال دینی ہے یہ وہ چیز ہے جو کسی صورت میں بھی اپنے پاس نہیں رہ سکتی تو جو ایسی چیز ہو اس کے دے دینے میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کو یوں اہمیت دی جائے! یہ تو دلوں میں موت کا ڈر بیٹھانے کا موجب ہے کہ جان نثاری کو اتنی اہمیت دی جائے۔ اللہ اکبر! ملاحظہ فرمائیے۔ ایک ان پڑھ مزدور کے خیالات۔ یہ ہے وہ انقلابی روح جو خاکسار کی اصل ہے اور جب تک یہ روح باقی ہے دنیا کی کوئی طاقت خاکسار کو نہیں مٹا سکتی۔ ہم خاکساروں کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ

ظاہر ہے زیادہ اس رُوح پر نگاہ رکھیں اور ملت اسلامیہ کے مفاد کلی کی خاطر آئین شکنی سے کامل احتراز کریں - اور اپنی روح کی پختگی میں اور زیادہ کوشش صرف کریں - یہ پختگی حاصل ہوگی مرکز کی اطاعت اور احکام شریعت کی پابندی سے - اگر وہ یوں اپنی رُوح میں پختگی پیدا کرلیں - تو دنیا کی کوئی طاقت ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی - اس کے ساتھ ہی ہم مسلم لیگ سے بھی گذارش کریں گے کہ وہ خاکساروں کو اپنے سے غیر نہ سمجھیں - انکی مصیبت کو اپنی (یعنی مسلمانوں) کی مصیبت سمجھیں - اوران کے تحفظ میں اپنی حفاظت - یقین مانیئے اگر یہ مٹ گئے تو آپ بھی -

کمی کوئی محسوس فرمائیگا!

ہمارا خیال ہے کہ مدراس کے سالانہ اجلاس کے بعد مسلم لیگ کو اپنی تمام توجہات دو تین امور کی طرف مرکوز کرلینی چاہئیں - اول - لیگ کو چاہیئے کہ پنجاب کو اپنا مستقل مرکز قرار دے لے - مسٹر جناح یہیں قیام فرمائیں - لیگ کا وفد تمام پنجاب کا دورہ کرے - اور جس طرح حکومت ہند نے صوبہ دہلی کے نظم و نسق کو براہ راست مرکز کے ماتحت رکھا ہوا ہے - اسی طرح پنجاب کی مسلم لیگ کو براہ راست مرکزی لیگ اپنی نگرانی میں رکھے یعنی وہاں صوبائی لیگ کے بجائے مرکزی لیگ کارفرما ہو - اور یوں وہاں کی تمام شاخوں کو منظم کیا جائے - پھر اس دائرہ عمل و نفوذ کو آہستہ آہستہ پھیلا کر - سرحد - سندھ - بلوچستان وغیرہ تک لیجائیں - پاکستان اس طرح تصورات سے ممکنات کی دنیا میں آسکے گا - پنجاب کا ایک ایک ذرہ لیگ کے مخلص کارکنوں کے لئے چشم براہ ہے وہاں کا ایک ایک فرد پاکستان کے لئے بیتاب ہے -

دوسرے یہ کہ جماعتِ خاکساران کے ارباب حل و عقد سے باہمی افہام و تفہیم سے ایسی راہ نکالیجائے کہ وہ جماعت مسلم لیگ کا ایک عسکری پہلو بن جائے - یہ چیز بظاہر دشوار سی نظر آتی ہے - لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد آپ دیکھیں گے کہ مرحلہ ایسا دشوار گذار نہ تھا جیسا بظاہر نظر آتا ہے اس میں اگر تھوڑا سا لیگ کو جھکنا پڑے یا ذرا خاکساروں کو نیچے آجانا پڑے - تو اس سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے کہ جہاں یہ ہر دو جماعتیں ملتِ اسلامیہ کی بہبود کی خاطر ایسی ایسی اہم قربانیوں کا تہیہ کئے ہوئے ہیں - وہاں اتنی سی "قربانی" کچھ مشکل نہیں ہونی چاہیئے - ہمارا خیال ہے کہ حالات اس افہام و تفہیم کے لئے بہت ساز گار ہیں شاید قران السعدین کا وقت آہی چکا ہو -

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

اور اس کے ساتھ ہی اپنا پریس۔ شمالی ہند سے اردو اور انگریزی میں روزانہ اخبارات۔ اس کی اہمیت کے متعلق کچھ بھی لکھنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ پنجاب میں "مسلم" پریس کی بالعموم جو حالت ہو رہی ہے اس کا عبرت ناک مرقع ہمارے سامنے ہے۔

اپریل رواں میں حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی وفات کو تین سال ہو جائینگے۔ خیال فرمائیے کہ اگر ایسا جلیل القدر پیغام بر حیات کسی اور قوم میں ہوتا تو اس وقت تک اس کے پیام کی نشر و اشاعت اور اس کے نظریات کی عملی تشکیل کیلئے کیا کچھ نہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن وہ ہم میں پیدا ہوئے۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ ابھی تک ہم "ذہنی عیاشی" کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس تین سال کے عرصہ میں بہت سے "اقبال ڈے" منائے گئے۔ تقریریں ہوئیں۔ نظمیں لکھی گئیں۔ مضامین پڑھے گئے۔ لیکن عملاً کیا ہوا! اس کا جواب بجز خیر کے سوا اور کیا ہے۔ ہماری بدبختی کی کوئی حد ہے کہ اس وقت تک ان کے منتشر افکار و مقالات بھی یکجا جمع نہیں ہو سکے۔ کہتے ہیں کہ آخری ایام زندگی میں انہوں نے قرآن کریم سے متعلق کچھ **نوٹ** لکھے تھے۔ آپ خیال فرمائیے کہ یہ متاع کس قدر قیمتی ہوگی۔ لیکن کچھ معلوم نہیں کہ ان کا ہی کیا حشر ہوا۔ ان کے بیشمار خطوط مختلف حضرات کے پاس پڑے ہیں جو ہماری گذشتہ بیس سال کی اجتماعی زندگی کے مختلف ابواب ہیں۔ لیکن اس وقت تک ان کی اشاعت تو ایک طرف یکجا فراہمی کا بھی کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ اور تو سب کچھ چھوڑئیے حالت یہ ہے کہ ان کی جو مطبوعہ تصنیف بازار میں ختم ہو جاتی ہے اس کے دوبارہ چھپنے کی باری بمشکل آتی ہے۔ **زبور عجم** ایک مدت سے نایاب ہے۔ آج تک دوبارہ نہ چھپ سکی۔ وقس علی ھذا جس قوم کی علمی زندگی کی یہ حالت ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس پیام حیات بخش کی نشر و اشاعت اور **درس** و تدریس کا مستقل انتظام کریں گی۔ امید موہوم ہے۔ حضرت علامہؒ کے ذمہ فطرت کی طرف سے جو فریضہ عائد ہوا تھا وہ اسے خوش اسلوبی سے ادا کر کے دنیا سے چلے گئے۔ اب یہ ہمارے لئے ہے کہ ہم اس سے کس حد تک متمتع ہونے کے متمنی ہیں۔ لاہور کی انٹر کالجیٹ برادرہڈ کے پیش نظر "مجلس تعمیر ملت" کا ایک خاکہ تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ تجویز کہاں تک آگے بڑھی۔ ہم ان نوجوانان ملت سے گذارش کریں گے کہ وہ سال کے بعد ایک "مرکزی یوم اقبال" تک ہی اپنا فریضہ نہ سمجھ لیں۔ انہیں اس سے آگے بہت کچھ کرنا ہے۔ وہ عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے قدم اٹھائیں **طلوع اسلام** کی خدمات

ان کے لئے وقف ہوں گی۔ اس باب میں ان کے سامنے جو جو موانع ہوں۔ ان سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ ہم خود ان کا حل سوچیں گے یا انہیں قوم کے سامنے پیش کر دیں گے۔ جن حضرات کے پاس حضرت علامہؒ کے غیر مطبوعہ افکار یا خطوط ہوں۔ وہ سر دست اس کی اطلاع طلوع اسلام تک پہونچا دیں تو بھی اچھی خاصی معلومات یکجا ہو جائیں گی۔

اس ماہ میں طلوع اسلام کی زندگی کے تین سال پورے ہو جائیں گے۔ اس مختصر سے عرصہ میں ہم نے کیا کیا۔ اس کا جواب آپ اپنے آپ سے طلب فرمائیے۔ اگر آپ نے اس عرصہ میں اندازہ فرمایا ہو کہ اس ادارہ کے ذریعے کوئی اچھا کام ہو رہا ہے تو اس سے تعاون قائم رکھئے اور اس سلسلہ کو اور وسیع کیجئے اور اگر آپ اس سے مختلف نتیجہ پر پہنچے ہوں تو ہماری کوتاہیوں پر ہمیں متنبہ کیجئے۔ ہم نے اپنی بے بضاعتی کے جس اعتراف اور اللہ کے فضل پر جس اعتماد، جن امیدوں اور آرزوؤں، جن التجاؤں اور دعاؤں کے ساتھ پہلا قدم اٹھایا تھا۔ سفر زندگی کے ان تین مراحل کے اختتام پر پھر انہی کو دہراتے ہیں۔ طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۳۸ء کا افتتاحیہ ان الفاظ پر ختم ہوا تھا۔

"لیکن یہ تمام انتظامات۔ اور ان سے متعلقہ مساعی۔ یہ تمام تدابیر اور ان کی جزرسی۔ یہ ولولے اور یہ ارادے۔ یہ تجاویز اور ان کی تکمیل کے لئے کوششیں۔ یہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے ذرائع۔۔ یہ سب انسانی دماغوں کی تخلیق ہیں۔ جو نہ غلطیوں سے مبرا ہیں نہ سہو اور فروگذاشت سے منزہ۔ جنہیں نہ کل کے آنے والے واقعات کا علم ہے۔ نہ اس پر تصرف و قدرت! لہذا یہ تمام انسانی کوششیں پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں رکھتیں۔ اگر اس خدائے حی و قیوم کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہو۔ کہ موت و حیات۔ کامیابی و ناکامی فلاح و خسران۔ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی اعانت شریک کار ہو۔ تو ادنیٰ سے ادنیٰ کوشش اور کمزور سے کمزور حرکت وہ نتیجہ پیدا کر دے کہ بڑے سے بڑے ساز و سامان رکھنے والے انگشت بدنداں رہ جائیں اور اگر وہی شامل حال نہ ہو تو دنیا بھر کی قوتیں اور ان کا ہجوم ایک ذرہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اس لئے بھروسہ نہ اپنی تدابیر و تجاویز پر ہے۔ نہ قوت و استعداد پر بھروسہ فقط اس کی ذات پر ہے جو ہر کمزور اور ناتوان کا حقیقی آسرا۔ اور ہر نحیف و زار کا یقینی ملجا ہے۔ بازار مصر میں ایک ضعیفہ کی سوت کی آنٹی یقیناً ہر صاحب دولت و حشمت کے چہرے پر ایک حقارت کی ہنسی کے آثار پیدا کر دیتی ہے لیکن چہ عجب کہ اسکے دربار

میں جہاں قیمتوں کے معیار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اسی آنٹی کی قیمت دولت کونین سے بڑھ جائے۔ رد و قبول تو اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سادہ دلی کی یہ جرأت ہی کسی کی شانِ استغنا میں ترحمِ خسروانہ کا ایک ہلکا سا تبسم پیدا کر دے۔ کہ یہ بے بضاعتی ملاحظہ ہو اور اس کے ساتھ یہ امنگیں اور یہ ولولے!! بہر حال جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے لیکر اس شاہنشاہ گدا نواز کے آستانے پر حاضر ہو رہے ہیں۔ اس التجا کے ساتھ کہ

کوہِ آتش خیز کن ایں کاہ را ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش اقبالؒ

ان دعاؤں اور ان التجاؤں کے ساتھ یہ پہلا قدم اس کے راستہ میں اٹھایا جا رہا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

یہ تین سال پہلے کی دعائیں تھیں۔ انہی کا آج ہم پھر اعادہ کرتے ہیں۔

نقد و نظر

تاریخ اسلام میں فیصلہ کُن مراحل
(انگریزی)

اسلام ایک عجیب ضابطۂ خیالات ہے۔ مانوس ہے تو بس قدر کہ فطرتِ انسانی اسمیں اور اپنے میں کوئی بُعد اور اختلاف نہیں دیکھتی - اور غیر مانوس یا "انوکھا" ہے تو ایسا کہ بڑوں بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہے کیا؟ مانوس ہے اسکے لئے جو فطرت کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں قرآن کریم پر غور کرے - اور غیر مانوس اس کیلئے جو انسانوں کے وضع کردہ معیار و اقدار کی رُو سے اس کا تجزیہ کرنا چاہے - یورپ کو مادہ پرستی نے "دانشِ نورانی" سے محروم کر دیا - اس لئے اس نے اسلام کے متعلق جب بھی غور کیا اسی غیر فطری اندازِ فکر سے کیا - نتیجہ یہ کہ خود بھی بھٹکے اور دوسروں کو بھی بھٹکایا - نبی اکرمؐ کی بعثت مقدسہ - اسلام کا ظہور - قرنِ اولےٰ کے مسلمانوں کی محیر العقول ترقی - یورپ کے مستشرقین کے لئے آج تک معمہ بن رہی ہے - وہ دیگر تاریخی حوادث کی طرح اسے بھی ایک اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہیں اور پھر اس کے لئے تاریخی اسباب و علل کی کڑیاں فراہم کرتے ہیں - اور جب یوں حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے - تو افسانہ طرازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہی راز جو قرآن کریم کی چند آیات سے واضح طور پر نکل جاتا۔ اُن کے لئے چیستاں بن گیا ہے - ان کا استدلال کچھ اِس انداز کا ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے عرب اپنی جاہلیت کی زندگی سے تنگ آ چکے تھے - اُن میں شجاعت، جرأت - جنگ آزمائی کے جوہر موجود تھے - (بقول ہیکم) خانہ بدوش کی زندگی نے اُن میں مختلف مقامات میں پھر نکلنے کا میلان پیدا کر دیا تھا - نبی اکرمؐ نے اپنے سیاسی تدبر سے ان حالات سے فائدہ اُٹھایا - اور خانہ بدوش عربوں کی ان قوتوں کو

Decisive Moments in the History of Islam by M. A. Enan

جو پہلے قبائلی ضرب وحرب میں ضائع ہوجاتی تھیں ۔ دوسروں کے مقابلہ میں صرف کیا جس سے اُنھیں فتوحات حاصل ہوگئیں ۔ بس یہ ہے لے دیکے یورپ کے مستشرقین کا "حاصلِ تحقیقات" انھیں کیا معلوم کہ نبیؐ کیا ہوتا ہے ؟ وحی کی تعلیم کسے کہتے ہیں، نظامِ مشیت کیا شے ہے ؟ ایمان، و اعمالِ صالحہ کیا نتائج مرتب کرتے ہیں ؟ استخلاف فی الارض کیسے حاصل ہوتا ہے ۔ حکومتِ الٰہیّہ کے قیام کے لئے کیا کیا شرائط لاینفک ہیں ۔ یورپ ان چیزوں کو کیا جانے ۔ یہ وہی جان سکتا ہے جس کے سامنے قرآن ہو ، یورپ کے مستشرقین پر اس باب میں کوئی افسوس نہیں لیکن افسوس آتا ہے ان مسلمان اربابِ فکر و نظر پر جو اسلام کو اہلِ یورپ کے چشمہ سے دیکھکر اس ضغطہ میں پھنس جاتے ہیں جسمیں مستشرقین اُلجھ رہے ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب اسی پریشانیٔ فکر و نظر کی آئینہ دار ہے ۔ کتاب کے مصنّف حکومتِ مصر کے پریس ڈیپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں ۔ اور مختلف کتبِ تاریخ کے مصنّف ، اس لئے ان سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہونگے ۔ لیکن افسوس ہوا کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی ترقی کے اسباب و علل کی تلاش میں وہ بھی اسی وادیٔ حیرت میں کھو گئے جسمیں مستشرقین مارے مارے پھرتے ہیں ، کتاب کا موضوع ہے " مشرق و مغرب ۔ اسلام اور عیسائیت کا تصادم " (دیباچہ) اور اسکی ابتدا ہوتی ہے ۔ قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی فتوحات سے جو مصنّف کے نزدیک " ایک ایسا تاریخی نظریہ ہے جو نہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے نہ سمجھایا جاسکتا ہے " (ص۳) لیکن ان فتوحات کی " دو بنیادی وجوہ " ان کے نزدیک حسبِ ذیل ہیں ۔

" ان خانہ بدوش قبائل پر اسلام کا " روحانی اثر " جو فتوحات کے ذریعے غلبہ و استیلا اور مال و متاع کے حصول کی غرض سے صحرا سے نکلے اور (۲) ان قوموں کی حالت جن سے ان عربوں کا تصادم ہوا " (ص۳)

اُنہی " دو بنیادی وجوہ " کی تشریح و تفصیل کتاب کا بنیادی موضوع ہے ۔ نبی اکرمؐ کی بعثت کے متعلق فرماتے ہیں ۔

" جس زمانہ میں نبی عربیؐ کا ظہور ہوا اس زمانہ کے حالات اس " نئے نظریہ " کیلئے

بہت سازگار تھے ...... بقول گبن - نبی اکرمؐ کی پیدائش حسن اتفاق سے اس وقت ہوئی جب ایران اور رومن سلطنتیں اور یورپ کے وحشی قبائل انتہائی پریشانی اور کمزوری کی حالت میں تھے۔" (ص۴۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں

"اس زمانہ میں جب کہ اہلِ عرب اپنے دل میں بڑی بڑی (فتوحات) کی اُمنگیں کہتے اور اپنی وحشیانہ زندگی کے نقائص سے تنگ آ چکے تھے - نبی عربیؐ پیدا ہوئے (ص۵)

یہ تو تھی پہلی وجہ - دوسری وجہ کے متعلق تحریر ہے -

"حقیقت یہ ہے کہ نوجوانانِ صحرا کی افواج، رُومی اور ایرانی لشکروں سے سامان اور خصوصیات کے لحاظ سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں - لیکن عربی افواج کی اکثریت ایرانی لڑائیوں میں (ایک) تجربہ کر چکی تھی - فنونِ حرب اور ضبط و انضباط کی جگہ اُن کے سینہ میں مذہبی جوش تھا - یہی جوش تھا جس نے رُومیوں کی بہادری کا مقابلہ کر لیا - عربی افواج میں" اندھی اطاعت" ایک نمایاں خصوصیت تھی - یہی شے اُن کی فنی کوتاہیوں کو پُورا کر دیتی تھی ...... لیکن یہ مذہبی جوش، خواہ کتنا ہی شعلہ سامان کیوں نہ ہو - عرصۂ دراز تک کی جدوجہد میں کام نہیں آ سکتا تھا۔ (ص۹)

یورپ نے شروع سے ہی یہ مقصد اپنے سامنے رکھا ہے کہ مسلمانوں کے دل پر یہ نقش کر دیا جائے کہ اُن کی ابتدائی فتوحات محض" مذہبی جنون "کی وجہ سے ہوگئیں - ورنہ اُن کی تعلیم ایسی نہیں جسکے مستقل نتائج و ثمرات سرفرازی و سربلندی کی زندگی عطا کرتے ہوں - وہ تو محض ایک اتفاق تھا - ایرانیوں اور رومیوں کا اندرونی خلفشار اور اس کے مقابلہ میں عربوں کا نیا نیا مذہبی جنون - اس کے سوا مسلمانوں کی فتوحات کا اور کوئی راز نہیں - اب نہ وہ قیصر و کسریٰ رہے نہ اس مذہبی جنون کا زمانہ - اس لئے اب اسلام کو سینے سے لگاتے لگاتے پھرنا اور یہ سمجھنا کہ ہماری عظمت و شوکت اسی کی راہ سے آئیگی - خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں - یہ ہے وہ خواب آور

نسخہ جو مستشرقین کے مطلب کے مرتب ہوکر ایک عرصہ سے مسلمانوں میں عام کیا جا رہا ہے۔ اور اسی سے ہمارے یہ مصری بھائی متاثر ہیں۔ آگے چلکر تحریر فرماتے ہیں:

"اس میں شبہ نہیں کہ عربوں نے اپنی پہلی فتوحات میں اعتدال۔ ضبطِ نفس اور لڑائی کے وحشیانہ طریقوں سے اجتناب کی نہایت بلند مثالیں پیش کیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مسلمانوں کی یہ انصاف پسندانہ پالیسی نہ تو اپنے اندر عمومیت رکھتی تھی اور نہ ہمیشہ تک رہنے والی تھی" (ملا صفحہ ۱۰۱)

یعنی اعتدال۔ ضبطِ نفس۔ جور و استبداد سے احتراز۔ ظلم و ستم سے اجتناب۔ یہ چیزیں محض بطور پالیسی کے اختیار کی گئی تھیں۔ مسلمانوں کی اس ابدی تعلیم کا نتیجہ نہ تھیں۔ اس لئے ہمیشہ تک نہیں رہ سکتی تھیں۔ یہی کچھ مغرب کے غیر مسلم مصنفین لکھتے چلے آرہے ہیں۔ زیر نظر کتاب کے ماخذ بھی۔ جیسا کہ اس کے دیباچہ میں تحریر ہے پیشتر مغربی مصنفین کی کتابیں ہیں۔ مصنف کو خود اعتراف ہے کہ وہ لوگ "مذہبی اور قومی میلانات" سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ ان کی تحریروں سے یہ چیزیں غیر جانبدارانہ اور جذبات سے خالی تحقیق کے ذریعے سے الگ کر دی جا سکتی ہیں"۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ مصنف اس باب میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان پر بُری طرح ان مستشرقین کا اثر غالب ہے، اور یہ اثر صرف اس صورت میں اُتر سکتا ہے۔ کہ ایک مؤرخ سب سے پہلے قرآن کریم کے مطالعہ سے ان حقائق کو سامنے لے آئے، جو صدر اوّل کے مسلمانوں کی جد و جہد زندگی کے محرکات و اساسات تھے۔ اس کے بعد وہ تمام مشکلات آسان ہو جائینگی۔ جن میں مغرب زدہ ذہنیں گرفتار ہیں۔

اصل کتاب عربی میں لکھی گئی تھی۔ زیر نظر کتاب اس کا انگریزی ترجمہ ہے جسے شیخ محمد اشرف صاحب پبلشر کشمیری بازار لاہور نے نہایت حسن و خوبی سے شائع کیا ہے۔ قریب تین سو صفحات۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ فی جلد۔ ہم جناب پبلشر کی خدمت میں گذارش کرینگے کہ بہتر ہو کہ وہ اس قسم کی کتابیں شائع کرنے سے پہلے ان کے مسودات کسی بالغ نظر کو دکھا لیا

کریں تاکہ وہ جس قدر محنت کریں کسی مفید چیز کی اشاعت کے لئے کریں۔کسی کتاب کا محض "مصری" ہونا اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس کی اصابت کی سند نہیں ہو سکتا۔

۲۔ **محمد (سیرت) (انگریزی)** حافظ غلام سرور صاحب ایم، اے (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج سنگاپور) کی لکھی ہوئی سیرت مقدسہ۔ شائع کردہ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور۔ کتابت، طباعت۔ جلد عمدہ ۔ ۴۰۵ صفحات قیمت تین روپیہ ۸ / فی جلد۔

حافظ غلام سرور صاحب بہ حیثیت مترجم قرآن کریم اسلامیانِ ہند میں متعارف ہیں زیر نظر سیرت میں انھوں نے قرآن کریم کو سامنے رکھا ہے۔لیکن ان پر سب سے زیادہ اثر علامہ ہیکل (مصری) کی کتاب "حیات محمد" کا ہے۔جناب ہیکل کی یہ کتاب بڑی عمدہ ہے۔ اس لئے اس کے اثر سے حافظ صاحب کی کتاب کے اکثر حصے ممتاز ہو گئے ہیں۔حافظ صاحب کا ارادہ ہے کہ اس نہج پر خلفائے راشدینؓ کی تاریخ بھی لکھیں

۳۔ **ٹروٹسکی کا بیان** مترجم ایم۔ ایم۔ جوہر صاحب مکتبہ جامعہ نے شائع کی صفحات ۱۱۸، لکھائی، چھپائی عمدہ، کاغذ معمولی۔ قیمت ۱۰/

روس کے انقلاب نے جو بڑی بڑی شخصیتیں دنیا کے سامنے پیش کیں ان میں لینن کے بعد ٹروٹسکی اور اسٹالین کے نام بہت اہم ہیں۔اور اس انقلاب کا دلچسپ حصہ داستان ٹروٹسکی اور سٹالین کی باہمی چپقلش ہے۔جو آگے بڑھ کر سٹالین کی ڈکٹیٹری اور ٹراٹسکی کی جلاوطنی پر منتج ہوئی۔ ۳۷ء میں ماسکو میں سویٹ حکومت نے پاٹا اور ریڈک کے خلاف ایک مقدمہ چلایا جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ تمام مجرمین کے جرائم کی ذمہ داری ٹروٹسکی پر ہے اور وہی سٹالین کے خلاف تمام سازشوں کا روح رواں ہے۔جب یہ بیانات دنیا کے سامنے آئے تو امریکہ میں مسٹر ٹروٹسکی کی صفائی اور عذر داری کے لئے ایک کمیٹی بنی اور اس نے میکسیکو (جہاں ٹروٹسکی مقیم تھا) جاکر ٹروٹسکی کے بیانات قلمبند کئے۔گویا یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔

تاکہ عوام سٹالین اور ٹروٹسکی کے اختلافات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ٹروٹسکی نے اپنے بیان میں یہی کہا ہے۔ کہ وہ بیشک اسٹالین سے سخت اصولی اختلافات رکھتا ہے۔ لیکن وہ دہشت پسند نہیں اور اس نے کسی سازش میں حصّہ نہیں لیا۔ ٹروٹسکی کے اس بیان سے نہ صرف اس کے "صفائی کے بیان" کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ بلکہ انقلاب روس پر وافر روشنی پڑتی ہے۔ اور اس لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان چیزوں کی حیثیت نظری بحث سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک کیا اسٹالن اور کیا ٹراٹسکی۔ سب ایک ہی نوع سے متعلق ہیں ع

ہمیں بھلا اُن سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

۱۔ قرآن اور سائنس (انگریزی)
۲۔ معاشی مسائل کا اسلامی حل (انگریزی)

انجمن خدام الدین لاہور مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے پمفلٹ شایع کر کے عمدہ خدمات انجام دے رہی ہے پہلے یہ پمفلٹ بالعموم اردو زبان میں ہوا کرتے تھے لیکن اب انجمن نے اپنے دائرہ نشر اشاعت کو اور وسیع کیا ہے اور انگریزی زبان میں بھی پمفلٹ شایع کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ زیر نظر پمفلٹ انگریزی زبان میں ہیں۔ اور اُن کا مفہوم ان کے عنوان سے ظاہر ہے۔ کتابت، طباعت عمدہ۔ انجمن کے دفتر واقعہ شیرانوالہ گیٹ لاہور سے بلاقیمت مل سکتے ہیں۔ ہم ارباب انجمن کو ان کی حسن خدمات کی بنا پر درخور تبریک سمجھتے ہیں۔ اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کی ہمت میں اور اضافہ فرمائے۔

فردوسِ گم گشتہ

۲۲ / ۲۳ فروری کو مجلس تاریخ و تمدن کی دعوت پر دارالعلوم علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وقت بہت کم تھا اور مشاغل پیشِ نظر بہت زیادہ۔ بایں ہمہ ایک تیرتی ہوئی نگاہ سے جو کچھ وہاں دیکھ سکا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ قوم کے نوجوانوں میں قرآن کریم کی طرف ایک خاص رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اور اگر انہیں قرآن کی صحیح تعلیم سے روشناس کرا دیا جائے تو ان کے ساتھ بہت سی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ طلباء اور حضرات اساتذہ کے اجتماع میں پڑھا گیا۔ اس میں کئی ایک چیزیں ایسی بھی ملیں گی جو اس سے پیشتر طلوعِ اسلام میں شائع شدہ مضامین میں آپ کی نظر سے گزر چکی ہوں گی لیکن اس مقالہ میں ان چیزوں کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس ربط و نظم سے مسئلہ زیرِ نظر واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ کسی کے لئے بھی نفع سے خالی نہ ہوگا۔

نوجوان طالب علموں کی لاابالیانہ بیباکیاں عام طور پر مشہور ہوتی ہیں۔ لیکن دارالعلوم علی گڑھ کے طلباء نے جس جذب و انہماک اور سکون و سکوت سے اس مقالہ (اور میری دوسرے وقت کی تقریر و مذاکرہ) کو سنا اور مختلف موضوعات پر سوال کئے۔ اس نے ان کی ذہنی و قلبی تعمیر کے متعلق میرے دل پر نہایت عمدہ اثر چھوڑا۔ میں طلباء اور ان کے ذمہ دار اصحاب اساتذہ کو اس باب میں درخورِ تحسین و تبریک سمجھتا ہوں۔ اور اربابِ مجلس تاریخ و تمدن کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس امر کا نہایت عمدہ انتظام کیا کہ میں اپنے خیالات ان نونہالانِ ملت تک پہنچا سکوں جو قوم کے مستقبل کے مظہر اور حضرت علامہ اقبالؒ کی ان دعاؤں کے محور ہیں۔

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

پرویز

کائنات کی ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ریت کے ذرّہ سے لیکر عظیم الشان کرۂ ارض تک۔ اس کرہ سے کئی لاکھ گنا بڑا سورج مع اپنے محیر العقول نظام کے۔ اور پھر اس نظامِ شمسی جیسے لاتعداد اور نظامِ اجرامِ سماوی، سب ایک متعینہ قاعدہ کے مطابق اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔ اگر زمین اپنے راستہ سے کبھی ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی کرلے۔ اگر ہوائیں اپنے رُخ کو طرفۃ العین کے لئے خلاف قاعدہ بدل لیں۔ اگر پانی اپنی فطرت کے خلاف نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔ غرضیکہ اس مشینری کا کوئی ایک پرزہ اپنے نظام سے سرتابی اختیار کرلے۔ تو یہ عظیم الشان کائنات ایک سکنڈ میں درہم برہم ہو جائے اور یہ تحیر انگیز کارگاہِ حیات مٹی کا گھروندہ بن کر رہ جائے۔ زندگی اور اس کی تمام رنگینیاں۔ دنیا اور اس کی تمام نُدرت آفرینیاں محض اس بناء پر قائم ہیں کہ فطرت کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت زندگی بسر کررہی ہے سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس حیرت خانۂ امروز و فردا کا ہر ایک پرزہ اپنے دائرۂ عمل میں پوری مستعدی سے اطاعت کوش ہے وَلِلّٰهِ يُسَبِّحُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ ہر شے اُس کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے

جب عالمِ موجودات کی ہر شے اس محکم اور غیر متبدل قانون پر عمل پیرا ہے تو کیا انسان جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جو نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے۔ وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہوگا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ بزمِ سخن میں ہر شعر عروض و قوافی کی حدود و قیود سے گھرا ہوا ہو لیکن حاصلِ مشاعرہ ربط و ضبط کی ان پابندیوں سے آزاد ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لیکر کونپل تک درخت کا ایک ایک حصّہ اپنی زندگی کے ہر مرحلہ میں قاعدے اور قانون کا پابند ہو۔ لیکن پھل ہر اصول سے بے نیاز ہو! ایسا نہیں ہوسکتا۔ جب کائنات کی ہر شے ایک خاص نہج اور اسلوب کے ماتحت زندگی بسر کررہی ہے۔ تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص قانون کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ قانونِ حیات جس کے مطابق انسان کے لئے زندگی بسر کرنا تقاضائے فطرت ہے۔ اسلام کہلاتا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰:۳۰)

خدا کا وہ قانونِ فطرت جس کے مطابق اس نے نوعِ انسانی کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی دینِ محکم ہے لیکن اکثر لوگ اس (حقیقت) کو نہیں جانتے۔

لیکن انسان اور فطرت کی دوسری چیزوں میں ایک بین فرق ہے۔ دیگر اشیائے فطرت اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ انہیں اس قانون کی تعمیل و عدمِ تعمیل میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ انہیں جو حکم دیا گیا ہے اس میں انہیں مجالِ سرتابی نہیں یارائے سرکشی نہیں۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ لیکن برعکس اس کے انسان کو اس معاملہ میں اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اسے آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو فطرت کے اس متعینہ ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ اسے زندگی کے دوراہے پر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں نہایت جلی حروف میں سائن پوسٹ نصب ہیں۔ سامنے عقل و فکر اور شعور و ادراک کی شمعیں فروزاں ہیں جن کی روشنی میں یہ سائن پوسٹ کو پڑھ کر دونوں راستوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے اختیار دیدیا گیا ہے کہ جس راہ پر چاہے گامزن ہو جائے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ؕ

اختیار و ارادہ کا یہی امتیاز ہے جس سے انسان دیگر مخلوقِ کائنات کے مقابلہ میں اشرف و اعلیٰ ہے۔ یہی قوتِ تمیز اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ مسجودِ ملائک و مخدومِ خلائق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُر کیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمیں بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے اور جامِ زندگی کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے سینۂ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے تموج سے۔ اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں تو اسی کے تحرک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہے تو اسی کی بدولت۔ اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر یہ اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بت ہوتا۔ یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ۔ مسجودِ ملائک اور مسخرِ کائنات کبھی نہ ہوتا۔ قصۂ آدم کا پہلا باب اسی اختیار و ارادہ کے مظاہرہ سے شروع ہوتا ہے جو معصیتِ آدم کی شکل میں سامنے آتا ہے نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت

رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد ہو۔ نیاز مندی اسی کی قابلِ ستائش ہے جو خود سراپا ناز ہو۔ اسی سر کے جھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہوں جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے تختِ حکومت نہیں اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے۔ اختیار میں جبر ہی انسانیت کا شرف امتیاز ہے۔ اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکامِ خودی ہی انسانیت کی معراج ہے لیکن یہی اختیار و ارادہ اگر آئین و ضوابط کے ساحلوں میں پابند نہ ہو جن کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنا تقاضائے فطرت ہے۔ تو اس دیو بے زنجیر کی حدود فراموش و قیود ناآشنا سیلاب انگیزیوں کا کیا ٹھکانا! بھلا سوچئے کہ جو انسان کائنات کی ہر شے کو تابع فرمان کرلینے کی امکانی قوتیں اپنے اندر رکھتا ہو۔ وہ اگر اپنی قوتوں کو آزاد چھوڑ دے تو دنیا کن ہولناک بربادیوں کا عبرت انگیز مرقع بن جائے گی!

یہی وہ خلافِ فطرت آزادی تھی جس نے یورپ کے ان میدانوں کو جن کا ہر گوشہ کل تک دامانِ باغبان وکفِ گلفروش کا حسین نظارہ درآغوش تھا۔ آج آگ اور خون کا ایسا جہنم بنا دیا ہے جس میں انسانیت تڑپتی پھڑکتی جھلستی۔ بلبلاتی۔ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہے۔ یہ کیوں ہوا! اس لئے کہ یورپ نے اختیار وارادہ کو ابلیسانہ سرکشی تو سکھا دی لیکن ؎

عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

جس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

یہ آئین و ضوابط جن کے ماتحت زندگی بسر کرنا فطرتِ انسانیت ہے۔ وحیٔ خداوندی کے باہر کہیں نہیں مل سکتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ آئین و ضوابط عین فطرت ہیں تو انہیں کسی خارجی ذریعہ سے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے لئے فطرتِ انسانی کی آواز ہی کافی ہو سکتی تھی۔ یہ درست ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان کی فطرت پتھر کی

فطرت نہیں جس پر کوئی خارجی شئے اثر انداز نہ ہو سکے۔ جسے آپ آج انسانی فطرت کہتے ہیں ذرا پوچھئے علم تجزیۂ نفس (PSYCHO-ANALYSIS) کے ماہرین سے کہ اس کی کیفیت کیا ہے اور یہ کن خارجی اثرات و رجحانات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وراثت کے اثرات۔ ماحول کے اثرات۔ بچپن کی تعلیم و تربیت کے اثرات۔ قومی روایات کے اثرات۔ اور پھر آگے بڑھئے تو ان اخلاط کے اثرات جن سے جسم انسانی ترکیب پاتا ہے۔ ان تمام اثرات کے بعد اندازہ فرمائیے کہ صحیح فطرت کی آواز کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ ان اثرات کا تو یہ عالم ہے کہ طبعی ضروریات میں بھی فطرت صحیح راہ نمائی نہیں کر سکتی۔ مثلاً ایک بکری کا بچہ بھوکوں مر جائے گا لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ ایک مرغی کے بچہ پر ہزار آفت آ رہی ہو وہ پناہ جوئی کے لئے پانی کے حوض کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھائیگا لیکن انسان کا بچہ سنکھیا کے ٹکڑے کو بھی اسی طرح بلا تکلف منہ میں ڈال لے گا جس طرح شکر کی ڈلی کو۔ وہ بلا تامل آگ میں ہاتھ ڈال دے گا۔ پانی کے حوض کی طرف لپک کر جائے گا۔ آپ کو قدم قدم پر اس کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ سو جس متاثر فطرت کی آواز کا یہ عالم ہو کہ حیوانی ضروریات میں بھی صحیح راہ نمائی نہ کر سکے۔ اسے انسانی ضروریات کے لئے کافی سمجھ لینا وہی نتائج پیدا کرے گا جو آج یورپ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انسان کی راہ نمائی صرف اس مقام سے ہو سکتی ہے جو ان تمام خارجی اثرات سے بلند و بالا ہو اور اس کا تعین وہی ذات کر سکتی ہے۔ جو انسانی جذبات، رجحانات اور میلانات و عواطف سے منزہ و مبرا ہو۔ یہ مقام، مقام وحی اور یہ ذات۔ ذات خداوندی ہے۔ وہ ذات جسے انسانی فطرت کے خلاق ہونے کی حیثیت سے خوب معلوم ہے کہ کس قسم کے آئین و ضوابط فطرت صحیحہ کے مطابق ہیں اور کن چیزوں سے اسے روکنے کی ضرورت ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰ : ۵۰) اس لئے انسان کو جب اس عالم اثرات و جذبات میں بھیجا گیا کشمکش حیات اس کے لئے مقدر کی گئی۔ تو ساتھ ہی یہ انتظام بھی کر دیا کہ اس کی فطرت کی صحیح راہ نمائی کے لئے آسمانی ہدایت بھی اسے ملتی رہے۔ اور اس سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ اگر اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہو گے تو تمہیں کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہوگا۔ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔

پھر انسان اور دیگر مخلوق کے اسلوب زندگی میں ایک نمایاں فرق اور بھی ہے۔ باقی مخلوق کی زندگی

انفرادی ہے۔ ایک کے اعمال کا دوسرے پر کچھ اثر نہیں پڑتا - ایک کو دوسرے سے کچھ لمبا چوڑا واسطہ نہیں ہوتا لیکن انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے - اسے مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے - ان کے مقاصد مشترک ہیں ان کے معاملات باہمدگر پیوست ہیں - یہاں ایک کے اعمال سے قوم کی قوم اثر پذیر ہو جاتی ہے - اگر ایک مستبد قوت برسرِ اقتدار آ جائے تو کروڑوں انسانوں پر جہنم کا عذاب مسلّط ہو جاتا ہے - اور اگر اس کے خلاف ان کے مقدرات کسی صاحبِ عدل و انصاف کے ہاتھ میں آ جائیں - تو یہی جہنم جنت سے بدل جاتی ہے - یہاں ایک بد اخلاق - دق کے جراثیم کی طرح پوری کی پوری سوسائٹی کو ہلاکت و بربادی کے مہیب غاروں میں دھکیل سکتا ہے - اور ایک خوش اطوار نرگس و لالہ کی طرح - ساری محفل کو جہانِ رنگ و بو میں تبدیل کر سکتا ہے - یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہزاروں زیر دست انسانوں کے خون کی رنگینی - کسی ایک بالادست کے عشرت کدہ کی زیبائش و آرائش کے کام میں لائی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی قوتِ بازو لاکھوں کی بھوک کی کفیل ہو جائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کی ہوسِ ستم رانی سے ہزاروں بے گناہ سینے گولیوں کا نشانہ بن جائیں اور یہ بھی امکان میں ہے کہ کسی ایک کی سپر لاکھوں مظلوموں کے لئے کاشانۂ امن بن جائے - ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت - قانونِ فطرت صرف وہی ضابطۂ حیات ہو سکتا ہے جس کا دائرۂ عمل افراد تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اس کے پیشِ نظر حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ کی اصلاح ہو - بلکہ یوں کہئے کہ وہ افراد کی اصلاح بھی اس لئے کرے کہ ان کے مجموعہ سے جو سوسائٹی متشکل ہو گی - وہ از خود اصلاح یافتہ ہو جائے گی - وہ مختلف پرزوں کا جائزہ لے - ان کے نقائص کو دُور کرے تاکہ ان کے نظم و نسق اور تدوین و ترتیب سے جو مشین تیار ہو وہ از خود اصلح و اعلیٰ ہو -

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اس قدر خارجی اثرات اور اتنی متخالف قوتیں انسان کی فطرتِ صحیحہ کے راستے میں حائل ہیں - تو انسانوں کی ہدایت کے لئے محض ایک ضابطۂ قوانین ہی کافی نہ ہو گا - بلکہ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی درکار ہو گی کہ قانون بلا قوتِ نافذہ ایک عام کتاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تعزیراتِ ہند - ہندوستان کے اندر ایک زندہ قانون ہے اس لئے کہ اس کے پیچھے ایک قوتِ نافذہ موجود ہے - لیکن یہی ضابطۂ قوانین - سرحد کے آزاد قبائل میں ایک عام کتاب ہے کہ وہ علاقہ اس قوتِ نافذہ کے احاطہ سے باہر ہے اس لئے قانون وہی زندہ کہلا سکتا ہے جس کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو -

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

لہٰذا جس خلّاقِ فطرت نے انسانی رشد و ہدایت کے لئے ضابطۂ قوانین عطا فرمایا۔ اس نے یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ اس قانون کی تنفیذ و ترویج کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۠

یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین (کتاب) اور میزانِ عدل نازل کی تاکہ نوعِ انسانی توازن پر قائم رہے۔ اور ہم نے (ان چیزوں کی محافظت کے لئے) فولاد کی شمشیر بھی نازل کی۔ جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کیلئے منفعت تاکہ اللہ یہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحب قدرت و تدبیر ہے۔

اس ضابطۂ قوانین کا نام ہے ہدایت خداوندی اور اس قوتِ نافذہ کا نام حکومتِ الٰہی۔ یہ بحث تفصیل طلب ہے کہ انسانوں کو کس حد تک اختیار ہوگا کہ وہ اس قانون کے تابع چلیں اور کس حد تک اس کی اتباع لازمی ہوگی۔ مجملاً یوں سمجھئے کہ اس ضابطۂ حیاتِ اجتماعیہ کی رو سے انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر بن جائیں جو دنیا میں قوانین خداوندی کے نفاذ کی ذمہ دار ہے اور دوسرے وہ جو اس کے ممبر نہ ہوں آپ ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس کے قوانین و ضوابط مرتب کرتے ہیں اب ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط کا بغور مطالعہ کرے۔ اور اس کے بعد جی چاہے تو اس سوسائٹی کی ممبری (رکنیت) قبول کرلے اور جی چاہے تو نہ کرے۔ اس پر کوئی جبر نہیں لیکن جب آپ اُس کی رکنیت قبول کر لیتے ہیں تو اس کے بعد آپ پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کے تمام قواعد و ضوابط کی اتباع کریں۔ آپ کو یہ اختیار کبھی نہیں دیا جا سکتا کہ جس قاعدہ کی جی چاہے اتباع کریں اور جس کی جی چاہے مخالفت کریں۔ جب تک آپ

اس سوسائٹی کے ممبر ہیں آپ کو تمام و کمال قواعد و ضوابط کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو کمیٹی سے مستعفی ہو جائیے۔ اب رہے وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر نہیں ہیں۔ سو ان پر ان قواعد و ضوابط کا تمام و کمال اطلاق نہیں ہوگا۔ لیکن چونکہ یہ مجموعۂ قوانین حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ کی اصلاح کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اس لئے جن امور کا تعلق عام انسانیت سے ہے ان سے متعلقہ قوانین کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سوسائٹی تپ دق کی روک تھام کے لئے متشکل ہوتی ہے۔ کچھ قواعد و ضوابط تو ایسے ہوں گے جن کا اطلاق صرف اس سوسائٹی کے اراکین پر ہوگا۔ لیکن اس مرض سے متعلقہ امور کے حصہ قوانین کا اطلاق ممبر اور غیر ممبر دونوں پر ہوگا۔ دق کے جراثیم جہاں کہیں بھی معلوم ہوں گے ان کے استیصال کے لئے ان ضوابط کے ماتحت ضروری کارروائی کی جائے گی۔ اور ان قوانین کا نفاذ کبھی جبر نہیں کہلائے گا۔ یہ ایسا ہی جبر ہے جیسا ایک ڈاکٹر کسی مریض پر آپریشن کرنے میں زبردستی کرتا ہے۔ اسے کوئی صحیح العقل زبردستی نہیں کہہ سکتا۔ اگر کسی اندھے کو کنوئیں میں گرنے سے زبردستی روک لینا اس پر زیادتی نہیں۔ کسی بچے کے ہاتھ سے بجبر چاقو چھین لینا اس پر ظلم نہیں۔ کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کرکے اس کے اس اختیار کو اس سے سلب کر لینا ناانصافی نہیں۔ تو عام انسانوں کی مسخ شدہ فطرت کو راہ راست پر چلانے کے لئے قوانینِ صحیحہ کا نفاذ بھی جور و تعدی نہیں کہلا سکتا بالخصوص اس لئے کہ فطرتِ صحیحہ کی خلاف ورزی کے نتائج۔ قوانینِ طبعی کی طرح ایسے محسوس اور بدیہی نہیں ہوتے کہ انسان اس سے از خود اجتناب کرنے لگ جائے۔ مثلاً انسان کی زندگی کا مدار سانس پر ہے۔ ذرا اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منہ اور ناک بند کر لیجئے۔ خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ اس معصیت کوشی کا نتیجہ کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو حالانکہ یہ بھی اسی طرح خلافِ قانونِ فطرت ہے جس طرح سانس روک لینا۔ لیکن اس معصیت کا نتیجہ محسوس طور پر اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ اس سے کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ وہ محسوس کرے یا نہ کرے۔ اس کا نتیجہ تو مرتب ہو کر رہے گا۔ یہی وہ نتائج ہیں جن کا مجموعی اثر۔ غیر محسوس طور پر انسان کی تمدنی۔ عمرانی۔ معاشی۔ معاشرتی۔ اخلاقی۔ سیاسی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کر دیتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ انسان کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسی قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے کہ انسانوں کو اس معصیت کوشی سے روکا جائے جس کے اثرات اس قدر دور رس

اور عالمگیر ہوں - یہ انسان کے اختیارات کو کچل دینا نہیں ہوگا بلکہ دراصل اس کی خواہشات کی تحدید ہوگی - اور ظاہر ہے کہ نظامِ انسانیت تحدید سے ہی قائم رہ سکتا ہے - اگر کسی کا پاؤں زہر آلود ہو جائے تو اس کی پنڈلی کو ایسا کس کر باندھ دیا جاتا ہے جس سے اوپر کا حصہ اس زہر کے اثر سے فی الجملہ محفوظ ہو جائے - اور اگر ڈاکٹر دیکھے کہ زہر کا اثر اس سے بھی نہیں رکتا اور اندیشہ ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ باقی حصۂ جسم بھی متاثر ہو جائے گا تو وہ جسمِ انسانی کے کلی منافع کی خاطر پاؤں کاٹ ڈالتا ہے - یہی وہ تحدید و تادیب ہے جس سے حیاتِ اجتماعیۂ انسانیہ خلافِ فطرت اعمال کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے - اور یہ تحدید اسی صورت میں ممکن ہے کہ قانون کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو - اس قوتِ نافذہ کی اطاعت کسی غیر کی غلامی نہیں بلکہ نفسِ انسانی کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہوگی - یہ کسی انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہوگا کہ جس سے انسانی خودی کا آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے - بلکہ قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت ہوگی جس سے خودی کا استحکام ہوتا ہے -

جبر و اطاعت کی اس بحث کو پیشِ نظر رکھئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ اصلاحِ انسانیت کا یہ نظام کس انداز سے قائم کیا گیا - جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ التزام بھی فرما دیا کہ جس جماعت کے ہاتھوں اس کے قوانین کا نفاذ ہو - انہیں خلافتِ ارضی سے بھی سرفراز کیا جائے تاکہ اس ضابطۂ الٰہی کو ایک زندہ قوت کی حیثیت حاصل ہو - یہ محض نظری مسائل کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائے - قوت اس قانون کی محافظ ہو - اور قانونِ خداوندی اس قوت پر ایسا ضبط اور (CONTROL) رکھے کہ یہ کہیں ناجائز استعمال نہ ہو سکے - قرآن اور قوت نہ صرف لازم و ملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے کے محافظ بھی ہے

ایں دو قوت حافظِ یکدیگر اند ۔۔۔۔۔ کائناتِ زندگی را محور اند -

اگر آپ قرآنی حقائق پر غور فرمائیں یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ خدائے حی و قیوم کا وہ ازلی پیغام جو حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا اس باب میں اس کا شروع سے ایک ہی اسلوب اور ایک ہی طریق رہی یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت و قوت کی زیادتی اور ان کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو ابھار کر انسانیت کی

بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایسی حیات پرور تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیوب پیدا نہ ہوں جو قوت کے غلط استعمال سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں وہ قوانین الٰہیہ سے منہ موڑنے والے انسانوں سے بادشاہی چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے اور اس کے ساتھ انہیں وہ ضابطۂ حیات عطا کرتے تھے جس سے ان کے اور ان کے خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور وہ یوں زمین و آسمان کی بادشاہت کے وارث بنتے چلے جائیں۔ بس یہ ہے خلاصہ اس تعلیم فطرت کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اور اسی پر عمل پیرا ہونے کا نام دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سرخروئی ہے۔ میزانِ خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہئے۔ نظام انسانیت کی گاڑی کے دو پہئے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار ہونے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضائے بسیط میں اڑنے والے شاہین کے دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے نہیں ابھر سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدوسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ قرآن کریم میں حضرت انبیاء کرامؑ اور امم سابقہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت ابھر کر آپ کے سامنے آجائے گی۔ ایک سورۃ اعراف کو ہی دیکھئے۔ حضرت نوحؑ کے بعد جہاں حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیب علیہم السلام کے سلسلۂ رشد و ہدایت کا ذکر ہے۔ وہاں ان کی اقوام کے متعلق یہ صراحت موجود ہے کہ انہیں سطوت و اقتدار اور حکومت و قوت کی نعمتوں سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ سلسلۂ انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ اس مقدس گھرانہ کے متعلق تصریحاً فرمایا کہ انہیں کتاب و حکمت کے ساتھ "ملکِ عظیم" بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کے تمکن فی الارض کا حیات پرور تذکرہ احسن القصص کے زریں عنوان سے قرآن کریم کے صفحات پر جگمگاتا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان۔ اسی قوت و حشمت اور تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس انداز سے جاری تھا کہ حضرت انبیاء کرامؑ خاص وقت اور خاص اقوام کے لئے تشریف لاتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا پیغام یا تو بھلا دیا جاتا۔ یا اس میں الحاق و تحریف کر دی جاتی۔ پھر اس کے بعد ایک نئے ایڈیشن کی ضرورت پڑ جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہد شعور کو پہنچ گئی۔ انسانیت پر شباب آگیا۔ اب وہ وقت تھا کہ انسانوں کو ایک مکمل ضابطۂ حیات

دے دیا جاتا ۔ جو ان کی قیامت تک کی ضروریات کے لئے آکتفا کرتا ۔ اور اس ضابطۂ قوانین کو محفوظ و مصئون رکھا جاتا ۔ یہ ضابطۂ قوانین ملا اور اس کے ساتھ ہی اس کی حامل جماعت کو ایسی سطوت و اقتدار کی زندگی عطا ہوئی کہ جس کی مثال اُمم سابقہ میں کہیں نہیں ملتی قدوسیوں کی اس جماعت کے ہاتھوں ۔ خدا کی حکومت کا تختِ جلال اس زمین پر بچھا دیا گیا اور ان تمام غیر فطری بندشوں کے طوق و سلاسل توڑ دیئے گئے جن کے نیچے انسانیت صدیوں سے دبی چلی آتی تھی ۔ یہی مشیت کا منشا تھا ۔ یہی پیغام خداوندی کا مقصود تھا یہی انسانیت کی معراج تھی ۔ اس تکمیلِ نعمت اور اتمام دین کے بعد نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد اس نظام کو آگے چلانے کی کیا صورت اختیار کی گئی جو اب تک حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے چلا یا جا رہا تھا ۔ فرمایا کہ

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۳۵/۳۲

پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا

اور وراثتِ کتاب کے ساتھ ساتھ انہیں حکومت و مملکت کا بھی وارث بنا دیا ۔ سورۂ احزاب میں ہے کہ اُس نے تمہیں (حق کے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا ۔ اور ان زمینوں کا بھی جہاں ابھی تمہارے قدم نہ پہنچے تھے" اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح فرما دی کہ یہ کوئی محض اتفاقی امر نہ تھا جو تمہیں یہ شوکت و سطوت مل گئی بلکہ یہ ہمارا ٹھیرایا ہوا قاعدہ ہے ۔ یہ فطرت کا غیر متبدل قانون ہے ۔ سورۂ نور میں ہے کہ "جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں ۔ اور اعمالِ صالحہ کریں ۔ اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پیشتر اس لے (ان شرائط کو پورا کرنے والوں کو) حکومت عطا فرمائی تھی ۔ اور ان کے اس دین کو جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے متمکن کر دے گا ۔ اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا تاکہ وہ صرف اللہ ہی کے محکوم ہوں اور اس کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کریں" وارثین کتاب کی جماعت کا فریضۂ حیات کیا ہوگا؟ فرمایا! كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ تم وہ بہترین

قوم ہو جو تمام نوع انسانی کی ہدایت کی خاطر پیدا کی گئی ہو۔ تمہارا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ تم قوانین الٰہیہ کا حکم کرو۔ اور لوگوں کو اس کے خلاف دوسری باتوں سے روکو"۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہو گی کہ اسلام کے تین عناصر ترکیبی لاینفک ہیں ۔

اوّل ۔ ضابطۂ قوانینِ الٰہیہ

دوم ۔ قوتِ نافذہ

سوم ۔ ان دونوں کی حامل جماعتِ مومنین یا حزب اللہ

اس قدسی دور کے بعد جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے ۔ قوت نافذہ کس طرح پہلے مسخ اور پھر معدوم ہو گئی ۔ یہ داستان بڑی الم انگیز ہے اور اس کا دہرانا بڑا دلخراش ۔ لیکن قوت کا مٹ جانا اتنا درد انگیز نہیں جتنا حیات اجتماعیہ کے اسلامی تخیل کا قلب و دماغ سے محو ہو جانا ۔ آج حقیقت بیں آنکھیں جب اس محرومی پر نگاہ ڈالتی ہیں تو فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ یکسر اسلام کا یہ بنیادی عنصر کس طرح عجمی تصورات کے رنگین پردوں میں چھپ گیا جس کی وجہ سے اسلام اپنے مقام بلند سے اتر کر عام انسانی مذاہب کی طرح انفرادی نجات اور ذاتی تزکیۂ نفس کا ذریعہ بن کے رہ گیا ۔ اور یوں مسلمانوں کے رگ و پے میں وہ رہبانیت عملاً سرایت کر گئی جس کے خلاف اسلام ایک کھلی ہوئی بغاوت تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ۔ اسلام، نفوس کا تزکیہ اور افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ ان کے مجموعہ سے جو جماعت تیار ہو وہ از خود اصلاح یافتہ ہو ۔ اس کے نزدیک ایک پرزہ خواہ کتنا ہی پختہ اور درست کیوں نہ ہو ۔ اگر وہ اکیلا پڑا ہے تو اس کی کوئی قیمت نہیں ۔ اس کی قیمت صرف اس وقت ہے جب وہ مشین میں اپنے صحیح مقام پر فٹ ہو اور اس کی ہر حرکت دوسرے پرزوں پر بایں نمط اثر انداز ہو کہ ان تمام پرزوں کی حرکات کا مجموعی نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے ۔ اگر آپ کتاب و سنت اور تاریخ و آثار پر نگاہ ڈالیں تو اس حقیقتِ باہرہ کے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی نہ پڑے کہ اسلام نام ہی جماعتی زندگی کا ہے ۔ اجتماعی زندگی کے بغیر اسلام کا تصوّر ہی غلط ہے ۔ لہٰذا ایک دیدۂ بینا کے لئے خون کے آنسو رونے کا مقام وہ نہیں جہاں اسے مسلمانوں کی لٹی

ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی شوکت کی یاد آئے ۔ بلکہ وہ مقام ہے جہاں اسے یہ نظر آئے کہ اسلام جیسا حیاتِ اجتماعیہ کا مذہب کس طرح محض انفرادی اصلاح کا نظریہ تصور کر لیا گیا ۔ اسلام کا یہ صحیح تصور صدیوں سے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور اس کے احیاء کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی ۔ کہ ہماری خوش بختی سے اللہ تعالےٰ نے ہمارے زمانہ میں ایک ایسے مردِ خود آگاہ و خدامست کو پیدا کر دیا جس نے اپنی بصیرتِ قرآنی اور جرأتِ ایمانی سے عجمی تصوّرات کے ان تمام پردوں کو ایک ایک کر کے چاک کر دیا جس سے ان کے نیچے چھپی ہوئی شمع نورانی پھر سے انجمن آرا ہو گئی ۔ یہ مردِ مومن تھے حکیم الاُمّت علّامہ اقبال علیہ الرحمۃ ۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے　　سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اگر آپ حضرت علّامہؒ کے کلام پر اس نگاہ سے غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ آپ کے پیام کا نقطۂ ماسکہ ہے ملّت اور مرکز ۔ اور اسلام فی الحقیقت انہی کے التزام کا نام ہے یہ گئے تو اسلام بھی گیا ۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی　　چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ　　زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی　　جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہ تصور کہ ملّت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے ۔ اس کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے ۔ ان کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے ۔ ان کی مرکزیت ۔ انفرادیت میں گم ہو چکی ہے ۔ حضرت علّامہؒ کو خون کے آنسو رلاتا تھا ۔ بحضور رسالتمآبؐ عرض کرتے ہیں ؎

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است　　ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکارِ بے نظامِ او چہ گویم　　تو می دانی کہ ملّت بے امام است

وہ مسلمانوں کے منتشر ذرات سے ۔ پھر سے ایک ایسی ملّت کی تشکیل چاہتے تھے جو تمام اقوامِ عالم میں سر بلند ہو ۔ وہ اُمّت جو

میانِ اُمتاں والا مقام است | کہ آں اُمت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کار آفرینش! | کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

وہ ملت جس کا اندازِ زندگی یہ ہو کہ۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ | نگاہ او بشاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش | بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

وہ ملت جس کی صفات یہ ہوں گی کہ۔

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے | براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے | فقیرِ او بدرویشی امیرے

ایک زندہ و پائندہ قوم۔جیتی جاگتی قوم۔وہ قوم جس کے اعمالِ صالحہ کے درخشندہ نتائج دیکھکر دنیا پکار اُٹھے کہ۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا | کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی اُن کی | معاف کرتی ہے فطرت بھی اُنکی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال | یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

ایسے مسلمان جو ملتِ اسلامیہ سے اس لئے برگشتہ ہو جاتے ہیں کہ بہ نکبت دادبار کے نرغہ میں آچکی ہے یہ دورِ انحطاط سے گذر رہی ہے۔اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہی۔انہیں مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔اور سنئے کہ کس دلگداز پیرایہ میں فرماتے ہیں کہ۔

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او پر برآوردی | چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

ملتِ اسلامیہ کا وہ شجرِ مقدس جس کے سایہ میں تم پروان چڑھے۔تمہارے جیسے بے بال و پر ناتوانوں کو جس نے وہ بازوئے شاہین عطا کئے کہ جن سے تمہاری بلندیٔ پرواز کی داستانیں زبان زدِ خلائق ہو گئیں۔اگر آج اس درخت پر۔خود تمہاری ہی بدولت خزاں کا دور آگیا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سر سبز ٹہنی پر جا بسیرا کرنا دنیائے خودداری میں بڑی ہی گری ہوئی بات ہے۔

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی کا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن نامساعد حالات میں ہم گرفتار ہیں۔ کیا ان کے پیش نظر ہم مایوس ہو جائیں اور سمجھ بیٹھیں کہ اب تو کوئی فرشتہ آسمان سے اترے تو اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو سکے! یہ خیال بڑا غلط اور حقائق سے چشم پوشی پر مبنی ہوگا۔ اسلام جن تین عناصر خصوصی سے مرکب ہے۔ ان میں سے ایک۔ اور سب سے اہم عنصر ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے یعنی ضابطہ خداوندی جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے۔ ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ کے ساتھ اسی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے جس میں یہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں دیا تھا۔ اس ضابطۂ الٰہی کی موجودگی میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں دوسری قومیں اس لئے گر کر نہ ابھر سکیں کہ ان سے ہدایت خداوندی گم ہو چکی تھی۔ ہماری حالت ان سے اس باب میں مختلف ہے۔ جس حالت میں ہم آج گرفتار ہیں۔ قرآن کریم اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وراثتِ کتاب کی وہ آیۂ جلیلہ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے پوری آیت یوں ہے۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ
وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۔ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۳۵/۳۲

پھر ہم نے وراثتِ کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا (ان کے تین مدارج ہو گئے) ایک اپنے آپ پر ظلم کرنے والے۔ ایک درمیانی روش والے۔ اور ایک اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے۔

یہ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ کا درجہ وہی ہے جس سے ہم آج گذر رہے ہیں۔ تو کیا وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر لیتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو جاتے ہیں؟ کیا وہ زندگی سے ابدی طور پر محروم کر دئے جاتے ہیں؟ کیا ان کے لئے مایوسیوں کی ظلمت ناک گھٹاؤں میں امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہتی؟ قرآن سے تو ایسا مایوس کن جواب نہیں ملتا۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو اس کا نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ ہم اس جنّتِ ارضی سے نکال دئے گئے جو ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ تھی۔ اس کیفیت کو قرآن کریم قصۂ آدم میں اپنے

مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ آدم اپنی لغزش کی وجہ سے جنت کے مقامِ بلند سے نیچے گرا دئیے گئے۔ جب انہیں اس پستی کا احساس ہوا تو عرض کیا کہ

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ؕ

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اگر تو ہماری لغزشوں کی پردہ پوشی نہ کرے گا تو ہم خاسر و نامراد رہ جائیں گے۔

یہ وہی "اپنے آپ پر ظلم کرنا" ہے جس کا ذکر ابھی ابھی آیۂ توراثت کتاب میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ چھینی ہوئی جنت دوبارہ مل سکتی ہے۔ اور اس کی بازیابی کا طریقہ یہ ہے کہ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے۔ تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔

یہ ہدایت آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس لئے ہم اس جہنم کی پستی سے ابھر کر پھر اسی جنت کی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ہم گرے تھے۔ آدم کی لغزش۔ ابلیس کی لغزش نہیں ہے جس میں گر کر پھر ابھرنا نہیں، ٹوٹ کر پھر بننا نہیں۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اس کی سزا بھگت رہے ہیں لیکن

آخر گنہ گار ہیں کافر نہیں ہیں ہم!

ہم سے آدم کا سا سلوک کیا جائے گا۔ ابلیس کا سا نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہلاک کر کے اس کتاب خداوندی کو ان اقوام کے حوالہ کر دیا جائے گا جو تمرد و سرکشی کے طاغوتی جرائم کی پاداش میں عملاً جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی ہیں؟ میں تو ایسا نہیں سمجھتا!

جب ابدی مایوسی نہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی کیا سبیل ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ کے دو اجزاء لاینفک ہیں۔ قرآن کریم سے تمسک اور اجتماعی زندگی کے تخیل کا احیاء۔ قرآن کریم ہمارے پاس موجود ہے لیکن ہماری عملی زندگی میں اس کا حصہ کچھ اتنا ہی رہ گیا ہے۔ کہ

از زمین او آسماں ہمیں ری

حالانکہ خدائے زندہ کی یہ کتاب زندہ یکسر زندگی بخش ہے۔ ایسا ضابطہ قوانین ہے جس کا ایک ایک لفظ سراپا حق و یقین ہے۔ وَاِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ ۔ جس میں کہیں کسی جگہ شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں لاریب فیہ۔ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ حق کہتے ہی اسے ہیں جو ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ امٹ ہو۔ اپنی جگہ پر قائم ہو۔ حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے۔ علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو اور اس کے برعکس باطل وہ جو مٹ جانے والا ہو۔ جو باقی نہ رہ سکے۔ قرآن کا دعوے ہے کہ وہ حق ہے۔ باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ علم و دانش ہے۔ توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ کسی خاص قوم اور خاص جماعت کی ہدایت کے لئے نہیں۔ بلکہ نسلی۔ لسانی۔ طبقاتی۔ وطنی۔ قبائلی غرضیکہ تمام غیر فطری حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئین حیات ہے۔ عدالتِ خداوندی کے منبر پر آج قرآن کے علاوہ اور کوئی ضابطہ نہیں جس کے مطابق اقوامِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہوں۔ پھر جس طرح یہ صحیفۂ فطرت مکانی حدود سے بلند ہے۔ اسی طرح زمانی قیود سے بھی ناآشنا ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں بھی یہ کہدے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی اسی طرح قرآن کریم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا اب کسی اور راہبر کی تلاش کرو۔

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جائیے۔ جہاں اندر جہاں۔ زمانہ در زمانہ۔ ان کے پیچ و خم میں لپٹا ملے گا۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی کے متعلق ابتدائی انسان اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھائی جاسکتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا جاسکتا ہے۔ لیکن پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم۔ تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں گویا وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج پانی سے جس قدر کام لئے جاتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں بھی یہ خصوصیتیں پانی کے اندر موجود تھیں اور آج بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پانی کے اندر جس قدر قوتیں خوابیدہ ہیں وہ سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں اس فضاء کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی۔ آج اس میں ایتھر کی لہروں نے ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے۔ ایتھر تو پہلے بھی موجود تھا۔ اسی خلاء میں لپٹا ہوا اس انتظار میں تھا کہ انسانی علم و دانش کی سطح بلند ہوتے ہوئے اُسے آن چھوئے اور وہ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالہ

گردے۔ یہی حالت قرآن کریم کی ہے۔ زمانہ علم وعقل کی جن بلندیوں تک چلا جائے۔ اڑتا چلا جائے۔ قرآن کریم اس سے بھی دس قدم آگے نظر آئے گا۔ کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں۔ پھر قرآن کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ضابطۂ قوانین ہے۔ مذہب۔ سیاست۔ تمدن۔ تہذیب معاشرت۔ معاشیات غرضیکہ دین ودنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس کے اندر اصولِ ہدایت موجود نہ ہوں۔ وہ اصولِ ہدایت جن پر عمل کرکے ایک اونٹ چرانے والی۔ کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارا کرنے والی قوم۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر وکسریٰ کی دولت وسلطنت کی وارث بن گئی اور دوسری طرف دنیائے جہاں داری وجہاں بانی میں مکارمِ اخلاق کے اس مقام بلند تک پہنچ گئی جسے چشمِ فلک نے ایک مرتبہ دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے۔ قرآن کریم کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے۔ محض خوش عقیدگی کی بناء پر نہیں کہا۔ بلکہ بتوفیقِ ایزدی علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے۔ آج کے مسلمان نے بہت کم سمجھا ہے کہ قرآن ہے کیا!

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد۔ جہاں دیگر شود

لہٰذا آج ہمارے لئے سب سے پہلا مرحلہ قرآن کریم کو اپنی عملی زندگی میں راہ نما بنانا ہے اور دوسری چیز جماعتی زندگی کا تخیل ہے۔ ان دونوں کے امتزاج (یعنی ایمان واعمالِ صالحہ) کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ لیکن یہ کیفیت ایک دن میں پیدا نہیں ہوسکتی۔ آدم کو دوبارہ جنت حاصل کرنے کے لئے جن تدریجی مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ انہی منازل کو ہمیں بھی طے کرنا ہوگا۔ ہم پہلی ہی جست میں اس مقامِ بلند تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انقلاباتِ زمانہ کی برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے جی یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح ہم میں یہ تبدیلی آج ہی پیدا ہو جائے۔ ہم رات کو موجودہ حالت میں سوئیں اور صبح اٹھیں تو ہمارے گردوپیش عہدِ فاروقی کا ماحول گھیر رہا ہو۔ یہ آرزوئیں بڑی مقدس ہیں لیکن ان کا تعلق عملی دنیا سے زیادہ عالمِ تصورات سے ہے۔ آپ کی بنیادی تمنا بجا اور درست۔ لیکن عملی دنیا میں آپ کو ان تمام ارتقائی کیفیات سے لذت آشنا ہونا پڑے گا جو قطرہ پر گہر بننے تک گذرتی ہیں۔ ایک قدسی نفس رسولؐ کے زیر تربیت تو یہ ممکن ہے کہ انسانیت بجلیوں کے کندھے پر سوار ہو کر ارتقائی منازل طے کرتی جائے لیکن جب ہماری اصلاح

خود ہمارے ہی ہاتھوں اور ہم میں سے منتخب اربابِ قلب و دماغ کے ذریعے ہونی ہے تو قرآنی معیار کے مطابق اصلاح کی آخری منزل تو بتدریج ہی آئے گی۔ ہماری اصلاح کے ابتدائی مراحل تو ایسے غیر محسوس ہونگے کہ بظاہر ان میں اصلاح کا شائبہ بمشکل نظر آئے گا لیکن اگر ہم یہ خیال کر کے کہ اصلاح تو یہی قابل اعتناء ہے جس میں پہلا قدم آخری زینہ پر ہو۔ زینہ چھوڑ کر بیٹھ جائیں تو اس سے ہم اپنی موجودہ سطح سے ایک انچ بھی اوپر نہیں اٹھ سکیں گے۔ لہذا آج جو قدم مسلمانوں میں انفرادی زندگی کی بجائے اجتماعی زندگی پیدا کرنے کے لئے اٹھے مبارک ہے۔ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کا ساتھ دینا باعثِ سعادت۔ اور یوں ساتھ رہ کر اصلاح وارشاد کے پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا موجبِ رحمت۔ اگر مسلمانوں نے آج اس نقطہ کو سمجھ لیا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے تو رفتہ رفتہ ان کی لٹی ہوئی ثروتیں چھینی ہوئی دولتیں اور مٹی ہوئی عظمتیں۔ ایک ایک کر کے ان سے ہمکنار ہو جائیں گی۔ اور دنیا ایک بار پھر دیکھ لیگی۔ کہ

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

صحرا

بیا منزل کنیم اے ہمدم فرزانہ در صحرا
کہ دل بے پردہ بیند جلوۂ جانانہ در صحرا

زمیں تصویر یکرنگی، فلک نقش ہم آہنگی
فضا باشد مئے توحید را پیمانہ در صحرا

بہر گامے روا سجدہ، صنم پنہاں بہ ہر ذرہ
نباشد امتیاز مسجد و بتخانہ در صحرا

نیارد تاب ہائے وہو در و دیوار کاخ و کو
"بکام[1] دل تواں زد نعرۂ مستانہ در صحرا"

ہوائے صحن و بام و در بود نسوانیت پرور
شود نشو و نمائے ہمت مردانہ در صحرا

بیا دیوار بشکافیم زندان تمدن را
کہ چوں موج ہوا رقصیم آزادانہ در صحرا

چہ داند برگ گل در باغ روداد غم الفت؟
زبان خار خوش می خواند ایں افسانہ در صحرا

کجا باشد خبر دلبستگان شمع محفل را؟
کہ می سوزد چراغ لالہ بے پروانہ در صحرا

تبسم کردہ بر خود حجاب رنگ و بو طاری
اگر چشمت نمی بیند بجز ویرانہ در صحرا

نباید اے اسد ما را چرا ذوق بیابانہا
خدا را ہم پسند آمد بنائے خانہ در صحرا

اسد ملتانی

[1] مصرع علامہ مستغنی مرحوم ملک الشعرائے افغانستان

بہ سلسلۂ اصلاح

تعارف کے لئے ملاحظہ ہو
طلوع اسلام بابت
مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

جرم و گناہ

(از جناب مشتاق احمد خان صاحب افغان لیبر فاضل دیوبند و مولوی فاضل)

اس مضمون پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس لئے محسوس کر رہا ہوں کہ مسلمان کے عقیدہ میں آگیا ہے۔ کہ گناہ گاری اور اسلام دو متضاد حقائق نہیں ہیں۔ بلکہ گناہگاری کا اعتراف ایک طرح سے کسرنفسی اور خاکساری ہے مساجد اور خانقاہوں میں تو گناہگار کا لفظ کثرت سے سنائی دیتا ہے۔ بلکہ دعاؤں میں روزمرہ گناہ بخش۔ گناہ بخش کی صداؤں سے کان گنگ ہو جاتے ہیں۔ اور بے اختیار دل سے نکلتا ہے۔ اے میرے اللہ! تیری ذات سے یہ گناہ بخش کی بخشش کی درخواست مسلمانوں کی ذلت وادبار کی انتہائی مثال ہے۔ یا ان کی ذہنیت کے الٹ جانے کی دلیل ہے کہ وہ گناہ بخش، کے معنے گناہ معاف کر سمجھتا ہے۔ مگر اس پر بھی اسے معافی کا یقین نہیں ہے۔ کیونکہ وہ روزمرہ گناہ بخش، گناہ بخش کا وظیفہ دعاؤں میں جاری کئے ہوئے ہے۔ ورنہ ایک دفعہ اگر اس نے دل سے کہا ہوا اور اسے ضرورت بھی ہو کہ اس کے گناہ معاف ہوں تو اب اسے نیکیوں کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے اور گناہ کا بھول کر بھی نام نہ لینا چاہیئے۔ (اسی طرح کا اعتراف گناہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے توبہ بھی کہہ سکتے ہیں)

علماء کا ایک طبقہ تو اسے (گناہ کے مسئلہ کو) مسلمانوں کے لئے طرۂ امتیاز سمجھتا ہے وہ کہتا ہے کہ گناہ کرنے سے اگر مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے تو یہ خارجیوں کا یا معتزلیوں کا عقیدہ ہے۔ عقیدہ کے لفظ نے دلوں پر ایسی گرہ لگا دی ہے کہ اب عمل میں بھی گناہ کو روکنے والا کوئی نہیں رہا۔ ذرا کسی نے گرفت کی جھٹ اس پر خارجی اور معتزلی، کا فتویٰ جڑ دیا گیا۔ اور کہیں اس نظریہ (گناہ کی مخالفت کو شفاعت سرورِ کائنات کے مخالف سمجھ کر گناہ، کی مخالفت کرنے والے کو شفاعت کے منکر کا خطاب دے دیا۔

اس بحثا بحثی میں عوام کی چاندی ہی چاندی ہے۔ اور اس کا الٹا اثر یہ ہو رہا ہے کہ واعظ مساجد

ہیں نکلے ہندوؤں قوم کے بوڑھوں، جوانوں اور بچوں بلکہ عورتوں تک کی حاضری میں اپنے کو گنا ہگار کہہ کر ہر قسم کی بازپرس کے خطرے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور عوام میں بھی یہ مرض اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ **مسلمان** کو گنا ہگار سے الگ کرنا دشوار ہو رہا ہے۔

کہیں واعظ اور مولوی صاحب یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑاتے دکھائی دیتے ہیں کہ اُنظروا الیٰ ما قال (دیکھو اُسے جو کسی نے کہا ہے) اور لا تنظروا الیٰ من قال (یہ مت دیکھو کہ کس نے کہا ہے)۔ اب کسی کو حق نہیں رہا کہ وہ پوچھے کہ مولوی صاحب تم کون ہو؟ اور نہ یہ کسی کو حق پہنچتا ہے کہ کہہ سکے کہ جناب! آپ اپنے کہے (ما قال) کے بھی جب ذمہ دار نہیں ہیں تو دوسروں کو کیا پڑی کہ وہ آپ کے کہے (ما قال) کا **عمل** کریں۔

اگرچہ من قال پر نگاہ ڈالتے ڈالتے مسلمانوں میں قائل کی پرستش بھی کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے یہاں تک کہ اب وہ پرستش قول کی وجہ سے نہیں رہی بلکہ قائل کے جسم اور قبر تک کی پوجا ہو رہی ہے۔ ادھر پوجا کرنے والے کی یہ حالت ہے کہ وہ بھی عمل سے کوسوں دور جا پڑا ہے۔ ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ پوجا کئے جانے والے بزرگ کی نسل بھی "قابل پرستش" ہو گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں کہنے (اور کرنے) والے حضرت خواجہ اجمیریؒ ...... داتا گنج بخش صاحبؒ، شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ جیسے بزرگوں کے اقوال اور اعمال تو کہیں گوشۂ نسیاں اور خمول میں چھپ چکے ہیں اور ان کے مزارات سجدہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔ ہر سال شدّ رحال کر کے مسلمان زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ اور وہی زائرین واپسی پر لوگوں کی نگاہوں میں مقدس اور متبرک سمجھے جاتے ہیں۔

مسلمان میں گناہ کہاں سے آیا ہے؟

بعد غور ہم جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان نے ہندوستان میں آکر یا جنم لے کر اپنی حکومت کے دنوں میں ہندوؤں کا تمدّن اور ان کی بود و باش اختیار کی، اکٹھے رہنے سہنے سے زبان، لباس اور اخلاق و عادات میں بھی اشتراک سا آگیا۔ بلکہ اشتراک کی بجائے اکبر بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے سے ایک طرح کی وحدت اور یگانگت پیدا کرنا بھی مقصود تھی، تاکہ معمولی سا امتیاز تک بھی دونوں قوموں میں باقی نہ رہے۔ ہندو ہندو ہو نہ مسلمان مسلمان۔ سب ایک ہی مسلک اور طرز زندگی پر گامزن ہوں جس کو دین الٰہی اکبر شاہی کہا جانے لگا۔ اور اس مذہب یا طرز زندگی کو جو حکومت کے ایما اور اس کی منشا پر قائم ہوا

تھا ہندو اور مسلمانوں نے قبول کیا ۔ اس کے بعد گو یہ چیز رائج تو نہ ہو سکی تاہم اس کا گہرا اثر قوم میں باقی ضرور رہ گیا ہے ۔ عالمگیر اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ایک قوم کے خصوصیات زندگی میں قوم کی بقا سمجھ کر اسلام اور مسلمانوں کے احیاء (زندہ کرنے) کی کوشش کی مگر بگڑی ہوئی قوم ۔ ہندوستان کی آرام پسند ہوا میں پلی ہوئی قوم، خواب گراں میں بدمست اور مدہوش قوم کب جاگنے کا نام لیتی ؟ بلکہ الٹا ایسی گری کہ اورنگ زیب کی تمام کوششوں پر ان کے بعد پانی پھر گیا، اور مسلمان ہندو کے ہاتھ اس طرح فروخت ہوا کہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا اور دوسری قوم کی تمام باتیں اپنے اندر لے لیں ۔

بت پرستی کے بدلہ قبر پرستی اختیار کی ۔ فلسفہ ویدانت کو ہمہ اوست، کا رنگ دے دیا ۔ رسومات شادی اور غمی تمام تر ان سے لے کر اپنی زندگی میں داخل کر لیں ۔ یہاں تک کہ گناہ جو آواگون اور تناسخ کے عقیدہ کے بموجب زندگی کا لازمہ بلکہ دنیا کی پائداری اور بقا کا ذمہ دار تھا مسلمان اس پر اس قدر لٹو ہو گیا کہ اسے مغفرت اور شفاعت کا مدار اور موقوف علیہ سمجھنے لگ گیا ۔ اب تو یہ اپنے مشیروں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے ۔ کون گناہ ہے جسے مسلمان عمل میں نہ لاتا ہو ؟ اور گناہ بھی کس کا اپنی قوم کا ۔ ع

وائے گر از پس امروز بود فردائے

ہندوؤں کے ساتھ رہنے سہنے کا اثر پہلے ہی سے موجود تھا ۔ اس پر مرے کو مارے شاہ مدار ۔ حکومت ایسی قوم کی قائم ہو گئی جس کی تہذیب میں وہ باتیں گناہ ہی نہ تھیں جو مسلمانوں کے ہاں سخت گناہ قرار دی گئی تھیں ۔ اس موجودہ حکومت کی ہی تہذیب کا اثر ہے کہ پریس کی ابتدائی آزادی میں داستان امیر حمزہ ہیر رانجھا، سسی پنوں، صاحبان مرزا، اور سوہنی مہینوال جیسی ایمان سوز اور عمل کو تباہ کرنے والی کتابیں طبع ہو کر ہندوستان میں گھر گھر پہنچ جاتی ہیں ۔ ان کا ورد اور وظیفہ کیا جاتا ہے اور تصوف کے اداروں میں تو یہ کتابیں عشق کی راہنما سمجھی جاتی ہیں ۔ صرف لٹریچر ہی گندا اور خراب نہیں ہے ۔ بلکہ عملی طور پر شراب خانے اور چکلے بھی موجود ہیں جو تمام گناہوں کے منبع اور اصل ہیں ۔

ان حالات میں مسلمان کیوں نہ گناہ کرے، ہمسایہ قوم (ہندو) کے نزدیک گناہ ضروری چیز ہے حاکم قوم کی تہذیب ہی ایسی ہے ۔ لہٰذا گناہ گویا گھٹی میں پڑ گیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان گناہوں کی پشت سے نکلا گناہ کے پیٹ میں پیدا ہوا ۔ گناہ کی گودی میں پروان چڑھا، گناہوں کی گلیوں، کوچوں محلوں اور شہروں میں پھلا اور پھولا، تو گناہ ہمارا گوشت پوست ہے اور دل اور جگر ہے یہ ہمارا ہے ۔ اور ہم اس کے ہیں ۔ استغفراللہ

اسلامی عہد

اسلامی حکومتوں میں سے خلافت راشدہ کا ابتدائی عہد کسی قدر سنہری تھا کہ جن لوگوں نے صرف زکوٰۃ کی ادائگی میں مرکزیت کے تعلق کی پرواہ نہ کر کے انفرادی رنگ پیدا کرنا چاہا تھا یا زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرنے لگے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ خلیفہ اوّل نے حکم دے دیا تھا کہ جو لوگ زکواۃ کی ادائیگی میں ایک رسی۔ جو اونٹ اور بکری کے ساتھ وہ عہد نبوت میں دیا کرتے تھے۔ دینے سے گریز کریں گے ان سے قتال اور جہاد کیا جائے گا حضرت عمرؓ نے ہرچند ان کے مسلمان ہونے کو (جہاد کی رکاوٹ میں) پیش کیا مگر دربار صداقت سے ان کے ارتداد کا فتویٰ قائم رہا۔ جب حالت یہ تھی تو دیگر گناہوں کا وجود کہاں نظر آتا ہے؟ چور کے لئے بروئے نص قرآنی قطع ید (ہاتھ کاٹنے) کی سزا مقرر ہے تو زانی کے لئے حد شرعی موجود ہے۔

مگر موجودہ دور میں۔ جب کہ خواص اور عوام بوجہ غلامانہ ذہنیت گناہ کی غلاظت کو غلاظت ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے عقائد میں جگہ دے کر گناہوں کے اظہار سے شرماتے نہیں۔ اور گناہ کے خلاف جہاد کرنے والے کو اسلام سے بھی خارج قرار دیتے ہیں۔ گناہ کے خلاف قلم اٹھانا ٹیڑھی کھیر ہو گیا ہے۔ مگر اس خیال سے کہ اس راکھ میں شاید کچھ چنگاریاں موجود ہوں، اس خاک کے تودے میں شاید کچھ جواہر اور ہیرے دبے ہوں، ان مردوں کے شہر خموشاں میں شاید کئی زندہ روحیں موجود ہوں۔ گناہ سے تعلق کچھ کہنے کے لئے جرأت پیدا ہو گئی ہے۔

میری تلخ نوائی[لہ]، ذوق نغمہ کی کمیابی، میری حدی کی تیز خوانی، محمل کی گرانی کے باعث ہے اس قدر پھر عرض کر دوں کہ مسلمان، فرقوں کی آڑ میں حق کو حق سمجھنے سے گریز نہ کریں۔ حق جہاں کہیں بھی ہو لے لینا چاہیئے۔ اور جب ایک چیز کے لئے مکمل ہدایت قرآن کریم سے مل جائے تو کسی اور چیز کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے۔ اور اگر مسلمانوں کے کئی فرقوں میں گناہ سے متعلق اختلاف ہوا بھی ہے تو وہ بدعملی کی تائید میں نہیں پیدا ہوا بلکہ ایک علمی مسئلہ کے رنگ میں۔ وہ بھی زہد اور تشقف کی وجہ سے۔ کہ کیا گناہ سے ایمان جاتا رہتا ہے یا نہیں؟ اور وہ گناہ کیا ہوں گے؟ یقیناً چوری اور زنا جیسے گناہ نہیں ہوں گے کوئی اور گناہ ہوں گے جنکی تفصیل ہماری آنکھوں سے اس وقت اوجھل ہے۔ ہر ایک چیز اپنے محل پر ہی صحیح پرکھی جا سکتی ہے۔

لہ نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کمیابی — حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

علمی تحقیق گناہ کا لفظ جو فارسی ہے اس کے مقابل میں عربی میں بہت سے الفاظ ہیں جن کا موضوع اور مفہوم اگرچہ جُدا جُدا ہے مگر سب کا ترجمہ اردو میں گناہ کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔

مثلاً جُرم، موٹے موٹے گناہوں یعنی تکذیب انبیاء، استکبارِ نفس، اور تکفیرِ آیات اللہ پر بولا جاتا ہے۔ اور یہی بڑے گناہ دوسرے گناہوں کی اصل ہیں۔ ہر ایک گناہ کی تہ میں پیغمبر کی تکذیب، نفس کی بڑائی یا آیات اللہ کی تکفیر میں سے کوئی نہ کوئی جز مضمر ضرور رہتا ہے۔

فسق، حق اور صلاح کی راہ سے نکل جانے اور جماعتی زندگی سے گریز کر کے انفرادی زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔

فجور، اپنے لئے الگ راستہ نکالنے، حق سے روگردانی کرنے اور مرکز سے پھوٹ جانے کو کہتے ہیں۔

ذنب، اغراضِ نفسانی کے ماتحت حیوانیت کے مظاہرہ کرنے یا دوسروں پر عیب لگانے کو کہتے ہیں۔

عصیان، لغزش اور ترکِ طاعت کا دوسرا عنوان ہے۔

جُناح، (جس کا بگڑا ہوا لفظ گناہ معلوم ہوتا ہے) بمعنے میلان اور جھکاؤ استعمال ہوا ہے۔

خطا اور خطیئہ، صواب (درستی) کے ضد پر مستعمل ہوتا ہے۔

اثم، ناروا فعل کے عمل کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

سیّئہ، قبیح چیز کو کہتے ہیں جو حسنہ کی ضد ہے۔

اس مضمون میں صرف جرم، سے متعلق قرآنی ارشادات بیان کئے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٠ : ١٣﴾

اور ہم نے ہلاک کر دیا ہے امتوں کو تم سے پہلے جونہی انہوں نے ظلم کیا۔ اور آئے اُن کے ہاں ان کے رسول ساتھ بینات کے اور نہ تھے وہ کہ ایمان لائیں۔ ایسا ہی جزا دیتے ہیں ہم مجرم لوگوں کو۔

ثابت ہوتا ہے کہ اگلی قومیں اور امتیں ظالم ہونے کی وجہ سے ہلاک کر دی گئیں۔ جب کہ رسولوں نے ان کو خدا تعالےٰ کی طرف سے بینات بھی بیان کر دئے۔ مگر ان لوگوں نے ایمان کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ ظالموں کی طرح مجرم لوگ بھی سزا کے مستحق ہیں یعنی وہ بھی ہلاک کر دئے جاتے ہیں۔ گویا خدا تعالےٰ کے نزدیک ظالم اور مجرم ایک ہی سلوک کے سزاوار ہیں۔

(۲) فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (۱۰ : ۱۷)

پس جو شخص افترا کرے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ یا تکذیب کرے اس کی آیات سے تو بلاشبہ نہیں فلاح پاتے مجرم لوگ۔

سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع میں بتلایا گیا ہے کہ مومن ہی مفلح (فلاح یافتہ) ہوتے ہیں (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)
اور اس آیت میں واضح کیا گیا کہ مجرم فلاح نہیں پاتے اور نہیں پائیں گے اور یہی حقیقت ثابتہ ہے۔
(اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔)

معلوم ہوا کہ مومن اور مجرم دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ مومن مجرم نہیں اور مجرم مومن نہیں۔

(۳) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝
اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ (۱۰ : ۵۰)

کہ دو! - کیا تم کو معلوم ہے اگر آجائے تمہارے پاس عذاب اس کا سوتے ہیں یا دن کو کیا جلدی کریں گے (بھاگنے کی) اس سے مجرم لوگ؟ کیا پھر جس وقت واقع ہو جائے (عذاب) تم ایمان لے آؤ گے اس پر؟ اب؟ اور پہلے تم اس سے جلدی کرتے۔

فرمایا - اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مفر دار مجرم لوگ ہی ہیں - اور اس جگہ حضرت یونسؑ کے مخالف گروہ کو مجرم کہا گیا ہے - معلوم ہوا کہ پیغمبرؑ کی مخالفت جرم ہے۔ اور جرم کی سزا خدا تعالیٰ کا عذاب ہے - جو رات کو آجائے یا دن کو - وہ ٹل نہیں سکتا - اور نہ مجرم لوگ اس کی زد سے بچ کر نکل سکتے ہیں - آج تاریکی کے دور میں، اسلام کا قائل، آخری نبیؐ کا ماننے والا کیوں گناہوں میں پیغمبرؑ کی مخالفت دیکھ کر ان سے باز نہیں آتا - اور گناہوں سے نفرت کیوں نہیں کرتا -

(۴) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا
وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ (۱۰ : ۷۵)

پھر بھیجا ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے ہم خیالوں کی طرف اپنی آیات کے ساتھ پس تکبر کیا انہوں نے اور تھے وہ مجرم لوگ۔

اس مقام سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبرؑ کی تعلیم سے انکار کرنا بھی جرم ہے اور متکبر (تکبر کا خواہشمند) مجرم کہلاتا ہے۔

(۵) وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (۱۰ : ۸۲)

اور ثابت کرتا ہے اللہ تعالےٰ حق کو اپنے کلمات سے اگرچہ ناگوار ہی مجرم لوگ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مجرم لوگ احقاق حق کے مخالف اور اسے ناگوار سمجھتے ہیں۔ مگر خدائے تعالیٰ کو احقاق حق مطلوب ہے۔ وہ اسے ضرور پورا کرکے رہیگا۔

کیا اب بھی مجرم اور گناہگار کہلانے اور بننے کا حوصلہ ہو سکتا ہے؟

(۶) اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ (۱۱ : ۳۵)

کیا وہ کہتے ہیں؟ کہ افترا کیا اس نے اس کو کہہ دو: - اگر میں اس کو افترا کروں گا تو میرے اوپر ہے میرا جرم کرنا۔ اور میں بری ہوں اس سے کہ تم جرم کرتے رہو۔

اس آیت میں ایک نبی کی طرف سے اعلان ہے کہ میں بری ہوں تمہارے جرموں اور گناہوں سے۔ قرآن کریم پیغمبر ؑ کے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے تو مسلمان کس منہ سے کہتا ہے کہ گناہ کرنے سے ایمان قائم رہ جاتا ہے۔ فتدبر۔

(۷) اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ (۱۱ : ۵۲)

اے میری قوم! مغفرت طلب کرو تم رب اپنے کی پھر رجوع کرو اس کی طرف بھیجے گا (اللہ تعالےٰ) بارش کو تمہارے اوپر موسلا دھار اور زیادہ کرے گا تم میں قوت تمہاری قوت کی طرف اور مت پھرو تم اس حال میں کہ تم مجرم ہو (یا مت ولی بناؤ مجرم لوگوں کو)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ استغفار کرنے والی اور خدا تعالیٰ کی طرف توبہ (رجوع) کرنے والی قوم پر خدا تعالےٰ اپنی موسلا دھار بارشیں برساتا۔ ان کی قوتوں اور طاقتوں میں اور زیادتی بخشتا ہے۔ بخلاف مجرم لوگوں کے یا ان لوگوں کے جو مجرموں کو اپنا سرپرست سمجھتے ہیں وہ خدا تعالےٰ کی نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ استغفار اور توبہ کی راہ مومن کے لئے ہے اور کہ جرم استغفار اور توبہ کی الٹ راہ کو کہتے ہیں۔ گویا استغفار اور توبہ ایمان کے مرادف ہے۔

(۸) فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ

اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّنۡ اَنۡجَیۡنَا مِنۡهُمۡ ۚ وَ اتَّبَعَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِیۡهِ وَ کَانُوۡا مُجۡرِمِیۡنَ ○ (۱۱ : ۱۱۶)

پس کیوں نہ ہوئے اگلی امتوں سے جو تمہارے پہلے سے تھیں باقی رہنے والے جو روکتے فساد سے زمین میں، مگر تھوڑے اُن سے کہ نجات دی ہم نے اُن میں سے اور اتباع کیا ظالموں نے اس کا جس میں آسودہ تھے اور تھے مجرم۔

اس مقام پر زمین میں فساد سے روکنے والوں کا مطالبہ کرکے یہ فرمایا کہ بہت تھوڑے ہی ہیں جو فساد کو روکتے ہیں ورنہ اکثر لوگ جو ظالم ہیں وہ اپنی اس ظلم کی زندگی کو جس کو آسودگی سے تعبیر کرتے ہیں بہتر سمجھتے اور اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور وہی مجرم ہیں۔

(۹) حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ○ط (۱۲ : ۱۱۰)

یہاں تک کہ جب مایوس ہونے لگتے ہیں رسول (لوگوں سے) اور خیال کرتے ہیں لوگ کہ وہ جھوٹے گئے (اُن سے وعدے) آجاتی ہے ان (رسولوں) کو ہماری مدد۔ پس نجات دی گئی۔ ان کو کہ ہم مناسب سمجھتے ہیں (رسولوں کو) اور نہیں رد کیا جاتا ہمارا پاس (عذاب و خوف) مجرم لوگوں سے۔

جب پیغمبرؑ اتمام حجت کرکے اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ لوگ اب ہدایت کو نہیں مانتے اور ایک حد تک ان کے حق سمجھنے اور اس پر عمل کرنے سے ان کو مایوسی سی آنے لگتی ہے۔ اور مخالف لوگوں کو گمان ہونے لگتا ہے کہ بس جو وعدے پیغمبرؑ اُن سے کرتے ہیں وہ جھوٹ کئے گئے ہیں (گویا وہ تو ایک دوسرے سے پوری طرح مایوسی کی حالت میں ہوتے ہیں، رسولؑ قوم سے کہ وہ آئندہ نہیں مانیگی اور قوم رسولؑ سے، کہ بس اب عذاب کی امید نہیں رہی) تو اس وقت آجاتی ہے خدا کی نصرت، اور پیغمبروںؑ کو تو کامیابی ہو جاتی ہے اور اس مایوسی سے نجات مل جاتی ہے۔ اسی طرح میدان صاف ہوجاتا ہے اور مکذبین اور مجرمین سے عذاب نہیں ٹل گیا۔ جب مجرموں کی یہ حالت ہے تو کیا پیغمبرؑ کے متبعین اب بھی اپنے کو مجرم (گناہگار کہکر انکساری اور خاکساری کا حق ادا کریں گے۔ اور کیا اُن سے عذاب الٰہی ٹل جائے گا؟

(۱۰) وَ رَاَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ النَّارَ فَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ مُّوَاقِعُوۡهَا وَ لَمۡ یَجِدُوۡا عَنۡهَا مَصۡرِفًا (۱۸ : ۵۳)

اور دیکھا مجرموں نے آگ (نار) کو تو گمان کیا انہوں نے کہ وہ گرنے والے ہیں اس میں اور نہ پایا انہوں نے اسے رکنا (بچ جانا)

اس آیت میں مجرموں کے لئے "النار" کی سزا مقرر کی گئی ہے جس میں وہ گریں گے اور ان کو بھاگنے کی کوئی راہ نہ ملے گی۔ اور یہی وہ "النار" ہے جس کے متعلق قرآن کریم کی سورۃ بقرہ میں "اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ" آیا ہے۔ (نار کافروں کے لئے تیار کی گئی)۔ سوچو النار کافروں کے لئے ہے وہی النار مجرموں کے لئے مقرر کی گئی ہے مجرموں کو مؤمنوں کی صف میں شمار کرنے والے ذرا غور فرمائیں۔

(۱۱) اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ○ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ○ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ○ (۲۰ : ۷۴ تا ۷۶)

بے شک جو آئے گا رب اپنے کے پاس مجرم ہو کر پس بے شک اس کے لئے ہے جہنم۔ نہ مرے گا اس میں اور نہ جئے گا۔ اور جو آئے گا اس کے پاس مومن ہو کر جس نے عمل کئے صالح وہی لوگ ہیں جن کے لئے ہیں درجے بلند۔ بہشت عدن جاری ہوں گی جن کے نیچے نہریں ہمیشہ رہیں گے اس میں۔ اور یہ جزا ہے اس شخص کی جو پاکیزگی حاصل کرے۔

ان آیات میں مومن اور مجرم کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

مجرم کے لئے رب تعالٰے نے **جہنم** تجویز کر رکھی ہے جس میں وہ نہایت ذلیل ہوگا۔ نہ مرے گا اور نہ جئے گا اور مومن کے لئے **جنات عدن** ہے نہروں والی۔ جن میں دوام اور ہمیشگی ہے۔ کیا ہو گیا ہے مومنوں کو۔ خدا تعالٰے کی آخری ہدایت یافتہ قوم کو، جو تمام لوگوں پر خدا تعالیٰ کی طرف شہداء لتکونوا شھداء علی الناس قرار دی گئی ہے۔ کہ وہ مجرم ہونے میں بھی اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ کیا اب بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں گی؟ کہ مجرم کے لئے تو جہنم ہے۔ مگر چونکہ دنیاوی جہنم یعنی غلامی میں خوش ہیں۔ شاید آخرت کے جہنم کو بھی اس خوشی سے گزاریں گے۔ یاد رہے کہ جہنم میں تو آدمی نہ زندوں میں شمار ہوگا نہ مردوں میں۔ یعنی نہایت ذلت اور نامرادی سے گزرے گی۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔ (آنکھوں والے عبرت پکڑو)

(۱۲) يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝ كَلَّا ۚ (۷۰ : ۱۱ تا ۱۵)

دل سے چاہے گا مجرم کاش فدیہ میں دے دے اس دن کے عذاب سے اپنے بیٹوں کو اور اپنی بیوی کو، اور اپنے بھائی کو، اور اپنے خاندان کو جو اس کو پناہ میں لئے ہوئے ہے، اور ان کو جو زمین میں ہیں سب کو۔ پھر وہ اس کو نجات دے دے۔ ہرگز نہیں۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کی دلی خواہش یہی ہوگی کہ کسی طرح اس کو عذاب سے نجات مل جائے خواہ اپنے بیٹوں، بیوی، بھائی تمام خاندان اور تمام روئے زمین کے لوگوں کو (اگر ممکن ہو) فدیہ میں دینا پڑے یعنی مجرم کو نفسی نجات کے لئے اس قدر پریشانی ہوگی کہ تمام رشتہ دار اقارب اور تمام دنیا کے لوگوں کی قربانی کے لئے بھی تیار ہو جائے گا اگر اس کو نجات مل جائے۔ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ مجرم کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوگی اور نہ اس کو نجات ملے گی۔ جرم کی سزا اور عذاب کس قدر زبردست اور دہشتناک ہے؟ اور اپنی خلاصی کے لئے کس قدر ناممکن تدابیر سوچتے ہوئے قربانی اور فدیہ کے لئے آمادگی کا اظہار کرتا ہے۔ الامان

مجرم کی یہ کیفیت مسلمانوں کے لئے بیحد سبق آموز ہے اور عبرت انگیز۔ جرم سے تاامکان پرہیز کرنا چاہیے تاکہ آخرت میں اس قسم کے ہولناک عذاب سے نجات ملے۔

اس عنوان (جرم) کے ماتحت بارہ آیات سے ترجمہ اور تفسیر درج کی گئی ہیں انہیں آیات کے صرف حوالجات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ گویا اس موضوع پر اکتالیس آیات قرآن کریم میں آئی ہیں۔ ان مقامات کی طرف رجوع کرکے ان کا اردو ترجمہ دیکھ لیا جائے۔ (۱۵:۱۲ تا ۱۴ - ۱۵:۱۷ تا ۲۰ - ۱۰ و ۴۹:۱۹ - ۸۵ تا ۸۶ و ۲۵ - ۲۱:
۲۴: ۹۹ - ۲۶: ۲۰۰ - ۲۷: ۶۹ - ۲۸: ۱۷ - ۲۸: ۷۸ و ۳۰ - ۳۰: ۴۷ و ۵۵ - ۳۲: ۲۲ تا ۲۲ - ۳۴: ۳۲ - ۲۵:
۳۴: ۳۲ - ۳۶: ۵۹ - ۳۷: ۳۴ - ۳۹: ۳۲ و ۴۴ - ۴۳: ۷۴ - ۴۴: ۲۲ - ۴۴: ۳۷ - ۴۵: ۳۱ - ۴۶: ۲۵ - ۵۴: ۴۷ -
۵۵: ۴۱ تا ۴۳ - ۶۸: ۳۵ - ۷۴: ۳۹ تا ۴۳ - ۷۷: ۱۸ - ۷۷: ۴۶ - ۸۳: ۲۹) پہلا نمبر سورۃ کا ہے۔ اور دوسرا نمبر آیت کا ہے۔

خلاصہ

مجرم کا انجام خدا تعالیٰ کی طرف سے مجرم قوم ہلاک اور برباد کر دی جاتی ہے اور مجرم سے عذاب نہیں ٹل سکتا۔ آیات نمبر ۱ و ۳ و ۹ و ۵۰

مجرم کی تعریف اور جرم کی حقیقت
(الف) مجرم وہی لوگ ہوتے ہیں جو پیغمبر کی تعلیم سے انکار کرتے اور عمل سے جی چراتے ہیں اور پیغمبر کے خلاف عمل کرنے پر کوشاں رہتے ہیں۔ آیت نمبر ۴
(ب) مجرموں کے سینہ پر مونگ دل کر اللہ تعالیٰ حق کو ثابت کرتا ہے یعنی مجرم حق کے خلاف زندگی بسر کرنے والوں کو کہا جاتا ہے آیت ۵۔

(ج) خدا تعالیٰ پر جھوٹ گھڑنا اور افترا کرنا جرم ہے آیت ۶۔

(د) استغفار اور توبہ مجرموں کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ یہ مومن کا حق ہے۔ آیت ۸۔

(ھ) مجرم فساد میں کوشش کرتے ہیں۔ اس کو روک سکتے نہیں بلکہ اس میں خوش رہتے ہیں آیت ۸۔

(و) مجرم کے دل میں یہ بات اچھی طرح اثر پذیر ہو جاتی ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتا۔ آیت ۱۰

مجرم کی تدبیر مجرم نجات کی کوشش میں بیٹیوں، بیوی، بھائی، قبیلہ اور تمام دنیا کے لوگوں کو فدیہ میں دینے کی خواہش ظاہر کرے گا۔ مگر اس کی نجات نہ ہوگی۔ آیت ۱۲

مجرم اور مومن کا فرق مجرم جہنمی ہے اور مومن جنتی۔ مجرم نہایت ذلیل رہیگا نہ زندہ ہوگا اور نہ مریگا۔ مومن جنات میں عیش کرے گا۔ آیت ۱۱

باقی آیات کا خلاصہ ان میں بھی مجرموں کی تباہی اور ہلاکت کا پورا بیان ہے۔ کہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرم سے ضرور انتقام لیں گے، کہیں سے مجرم کی مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ کہیں اس کے لئے جہنم کا خلود ہے کہیں مخصوص پیشی کی سزا مجرم کو مل رہی ہے۔ کہیں مجرموں کو شیطان کا عابد قرار دیا جا رہا ہے۔ کہیں مسلمان کو مجرموں سے برابر کئے جانے کا انکار ہے۔

روح مضمون کسی ایک آیت سے بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مجرم مومن ہوتا ہے یا مومن کی کوئی قسم ہے یا مجرم سے عذاب کی معافی ہے۔ یا اس کے لئے مغفرت یا شفاعت نبوی کا

استحقاق ہے۔ اس قسم کی ایک آیت بھی پیش کرنے کی کسی میں جرأت نہیں ہے۔

استدراک کہیں اس مضمون سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ توبہ کی کوئی حقیقت اسلام میں نہیں ہے۔ توبہ ایک الگ حقیقت ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ انسان سے نادانستہ سہواً کوئی لغزش ہو جائے (ہو جانا اور چیز ہے اور کرنا اور چیز) تو اپنے کئے پر نادم ہو۔ اللہ تعالےٰ سے اس کی معافی کی درخواست کرے اور اس کے بعد اپنی اصلاح کرے۔ نہ یہ کہ

رات کو تھوڑی پی، صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

اور یہ عمل مسلسل ہر صبح شام جاری رکھا جائے۔

(توبہ) کے لئے کسی اور صحبت کا انتظار کیا جائے۔

والسّلام

حقائق و عبر

(۱) مردم شماری | مردم شماری کا ہنگامہ آیا اور چلا گیا۔ اب اس کے نتائج کا انتظار ہے۔ لیکن یہ ہنگامہ اپنے پیچھے بعض نقوش ایسے چھوڑ گیا ہے جو ہر دیدہ بینا کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ہم نے کئی مرتبہ لکھا کہ مسلمانوں کو ذات اور فرقہ بالکل نہیں لکھانا چاہیے۔ کہ اسلام میں ان چیزوں کی کوئی اصل نہیں۔ بلکہ یہ چیزیں تو روح اسلامی سے بغاوت کے مرادف ہیں۔ الحمد للہ کہ اس آواز کی ملک کے اطراف و جوانب سے تائید ہوئی۔ جن حلقوں سے اسکی مخالفت ہوئی ان کے متعلق ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ مثلاً مرزائی حضرات نے ضروری سمجھا کہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے متمیز حیثیت سے لکھائیں۔ انھیں اپنے آپ کو الگ لکھانا ہی چاہیے تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ اگرچہ یہ الگ بات ہے کہ ملازمتوں میں نیابت کے لئے وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی مخصوص اسامیوں کا سب سے بڑا حصہ دار سمجھتے ہیں اور اس وقت انھیں یہ کہنے کی کبھی جرأت نہیں پڑتی کہ چونکہ ہر فرقہ یا جماعت کو آبادی کے تناسب کے اعتبار سے اسامیوں میں حصہ ملتا ہے اس لئے ہم اپنی تعداد کے اعتبار سے ملازمتوں کے حصہ دار سمجھے جائیں۔ جو مسلمان مرزائی نہیں ہیں انکی تعداد کے تناسب سے ہم حصہ دار کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں کہیں گے۔ یعنی ملازمتوں میں حصہ داری کے لئے وہ مسلمانوں سے کبھی الگ نہیں ہوتے کہ ان کا اسی میں فائدہ ہے اور یوں سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مردم شماری میں اپنے آپ کو ایک الگ فرقہ لکھانے کے متعلق ان کا فیصلہ کسی حیرت و استعجاب کا موجب نہیں ہو سکتا۔ لیکن باعث صد تاسف ہے۔ ان حضرات کی روش پر جو اسلام کے بہت بڑے مدعی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو الگ فرقہ لکھانے پر مصر تھے۔ اخبار اہلحدیث (امرتسر) کی ۱۳ فروری ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں

اہلِ حدیث سے درخواست ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

" اسی فروری ۱۹۴۱ء سے مردم شماری ہونیوالی ہے۔ جو قوم بیداری اور عقل سے کام لیگی۔ آئندہ اس کو زندہ رہنے کا حق ہوگا۔ ورنہ نہیں۔ اکثریت کوشاں ہے کہ اقلیت کو مغالطہ میں ڈال کر مردم شماری میں اپنے اندر ضم کرلیں تو آئندہ اپنی من مانی مراد حاصل کرنے میں آسانی ہوگی کسی کی خوشی اور ناخوشی کا خیال نہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کوشاں ہے کہ سکھ اور اچھوت وغیرہ اپنا مذہب اور قومیت صرف ہندو لکھائیں۔ اسی طرح مسلم لیگ چاہتی ہے۔ کہ حنفی، شافعی، شیعہ، سُنی، اہل حدیث وغیرہ اپنا مذہب اور قومیت صرف "مسلم" لکھائیں ۔۔۔ لیکن سکھ اقلیت کے ذمہ دار افراد اپنی قوم کو کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنا مذہب اور قومیت ہندو اکثریت سے الگ سکھ لکھوائیں۔ اسی میں آئندہ ہماری مذہبی و سیاسی زندگی باقی رہے گی۔ مسلمانوں میں شیعہ اقلیت اس پر جمی ہوئی ہے کہ ہم "سنی" مسلم سے علیحدہ اپنا وہی مذہب لکھوائیں جو ہمارا عقیدہ ہے۔ جسکے ہم قائل ہیں۔

اہلِ حدیثوں کے بعض حساس اور باخبر افراد نے بھی اعلان کیا کہ اہلِ حدیث اپنا مذہب اہلِ حدیث لکھوائیں۔ مگر ذمہ دار افراد کی اسکے متعلق جو کوششیں ہونی چاہئیں۔ وہ نہ ہوئیں اور نہ ہو رہی ہیں۔ نہ کہیں عوام کو آگاہ کرنے کیلئے جلسے ہوئے نہ ہوتے ہیں۔ نہ اخبارات میں پے درپے بیانات شایع ہوتے ہیں۔ اس غفلت کا ادنیٰ خمیازہ آئندہ یہ بھگتنا پڑے گا۔ کہ مجلس قانون ساز میں جب کوئی قانون بنے گا تو ان مذہب والوں کا کوئی لحاظ، ان کے معتقدات کا کوئی خیال نہیں کیا جائے گا۔ جنھوں نے اپنا مذہب الگ نہیں لکھوایا۔ لاکھ چیخ پکار کریں گے، مگر کوئی شنوائی نہ ہوگی۔

مسلمانوں میں اکثریت حنفیوں کی ہے، ان کے بعد اہلِ حدیثوں کی۔ شیعہ وغیرہ کی تعداد مختصر ہے۔ مگر ان کی تنظیم بہتر ہے۔ اُن کے عوام بیدار ہیں۔ اُن کو کوئی اکثریت ضم نہیں کرسکتی۔

اگر اس مردم شماری میں اہلحدیثوں نے اپنا مذہب علیحدہ "اہل حدیث" نہیں لکھوایا، تو

پچاس سال پیچھے کے واقعات پر نظر رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ آیندہ ان کو اہل حدیث کہنے کا بھی غالباً حق نہ ہوگا۔ صحیح حدیثوں پر عمل کرنا تو بڑی بات ہے۔

میرے دعویٰ پر یہ ثبوت کافی ہے کہ لیگ نے اعلان کیا، تمام مسلمان اپنی قومیت اور مذہب "مسلم" لکھوائیں۔ بایں ہمہ کانگرسی مسلمانوں کو لیگ سے سخت اختلاف ہے۔ مگر کسی نے لیگ کے اس اعلان کی مخالفت نہیں کی۔ کیوں؟ ع کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

اس لئے میری تمام اہل حدیثوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنا اور اپنی عورتوں اور بچوں کا مذہب "اہل حدیث" لکھوائیں۔ اور زبان اُردو۔ خصوصاً صوبہ بنگال، بہار اور پنجاب کے اہل حدیثوں کو زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ جہاں اہل حدیثوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جہاں آمین رفع یدین۔ طلاق وخلع کے مسئلوں پر آئے دن مڈبھیڑ رہتی ہے۔ **وما علینا الا البلاغ**۔

یہ "درخواست" کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ مسلم لیگ کا جرم یہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں سے یہ کہتی ہے کہ وہ اپنا مذہب صرف "اسلام" لکھائیں! کوئی فرقہ نہ لکھائیں۔ کیونکہ فرقہ داری اور اسلام دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ قرآن کریم کی نص صریح کی رُو سے فرقہ وار کا توحید سے کچھ تعلق ہی نہیں رہتا۔

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون

"اور (دیکھنا) تم نے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان (لوگوں) میں سے جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ اندازی کی۔ اور خود ایک فرقہ بن گئے۔ پھر (حالت یہ ہوگئی) کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک پر مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

ادھر یہ تفریط اور دوسری طرف وہ افراط کہ حکومت کے نفس ناطقہ۔ اسٹیٹسمین نے مشورہ دیا کہ مردم شماری میں کسی کا **مذہب** نہیں لکھنا چاہیے۔ یہ مذہب ہی تو ہے جو تمام

جھگڑوں کی جڑ ہے۔

" مہذب ممالک میں، جہاں لوگ وطن کی باہمی محبت، کے رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں کسی شخص کو اس بات سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ کسی کا مذہب کیا ہے؟ ..... ہندوستان میں مردم شماری کے سلسلہ میں " مذہب کا خانہ " بہت بڑے نقصان کا سبب ہوا ہے۔" (اسٹیٹسمین ۱۰ جنوری)

وہی چیز جو ہندو چاہتا ہے۔ یعنی ہندوستان کا باشندہ محض ہندی ہونے کی حیثیت سے پہچانا جائے۔ مذاہب کی بنا پر تمیز و تفریق نہ ہو تاکہ متحدہ قومیت کا مکڑی کا جالا مضبوط ہوتا چلا جائے۔ ایک طرف اغیار یہ چاہتے ہیں اور دوسری طرف اپنوں کی یہ حالت ہے کہ وہ جب تک ملتِ اسلامیہ کو حنفی۔ شافعی کے ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر لیتے۔ انھیں چین کی نیند نہیں پڑتی۔ ان کے درمیان مسلم لیگ ہے جس کا مطالبہ ہے کہ مذہب ضرور لکھاؤ کیونکہ مسلمان کا امتیاز صرف مذہب سے ہو سکتا ہے۔ لیکن مذہب صرف " اسلام " لکھاؤ۔ کہ اسلام میں کسی فرقہ کی گنجائش نہیں ہے۔

مردم شماری کے سلسلہ میں برادرانِ وطن کی طرف سے جن بدعنوانیوں کا اندیشہ تھا، بنگال کے وزیر اعظم جناب فضل الحق صاحب نے بڑی جرأت و جسارت سے انھیں بے نقاب کیا۔ حق یہ ہے کہ یہ جرأتِ ایمانی انھی کے حصہ میں آئی ہے کہ حق کو حق کہنے میں کوئی مصلحت کوشی انکے گلوگیر نہیں ہو سکتی۔ ان کے مقابلہ میں ایک " مسلمان " وزیر اعظم پنجاب میں بھی ہیں۔ پنجاب کے دیگر اخبارات کو چھوڑیئے خود انقلاب نے مسلسل و متواتر لکھا کہ صوبہ بھر میں ہندوؤں کی طرف سے بے حد بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن قسم لے لو جو جناب وزیر اعظم۔ یا کسی دوسرے مسلمان وزیر کی زبان سے ایک لفظ بھی اسکے متعلق نکلا ہو۔ یہ فرق ہے ایک مرد جرأت پسند میں جسکے سامنے اصول صرف حق پرستی ہو اور ایک ایسے مصلحت کوش میں جسکے پیشِ نظر

اپنے طرۂ امتیاز کی سربلندی کے سوا اور کچھ نہو۔ ورنہ حکومت کی مشکلات جس قدر پنجاب میں ہیں۔ بنگال میں اس سے کم نہیں۔ اسمیں شبہ نہیں کہ جناب فضل الحق صاحب بعض اوقات اپنے جذبات کی رو میں حدود فراموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ حدود فراموشی، اس مصلحت کوشی سے ہزار درجہ بہتر ہے جسمیں غیروں کی رضا جوئی کی خاطر حق کا لفظ زبان تک نہ آسکے۔ جو حکومت اس انداز کی مصلحت کوشانہ مساعی پر قایم ہو۔ اس سے ایک مرد حق گو کی بوریہ نشینی اچھی۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبالؒ

جناب فضل الحق صاحب کی غیروں کے مقابلہ میں ایسی بے باکی (اعزۃ علی الکافرین) کا تذکرہ آگیا تو ذہن اس واقعہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ جس سے یہ حقیقت سامنے آئی تھی۔ کہ وزیر اعظم بنگال کے دل میں اپنوں کے سامنے غلطی کے اعتراف اور اپنے قائد کی عزت۔ توقیر اور اطاعت (اذلۃ علی المومنین) کا کس قدر بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جناب فضل الحق صاحب نے ہندو مسلم مفاہمت کی ایک تجویز پیش کی تھی۔ جو اخبارات میں شایع ہو گئی۔ اس پر مسٹر جناح نے انھیں لکھا کہ آپنے از خود اس قسم کی تحریک کیسے شایع کردی۔ کوئی اور ہوتا تو صاف جواب دے دیتا کہ میں نے یہ تحریک اپنی ذاتی حیثیت (یا بہ حیثیت وزیر اعظم بنگال کے) پیش کی ہے۔ آپ کو اس سے کیا؟ لیکن اس مردِ مخلص۔ اس اطاعت شعار سپاہی نے اسکے جواب میں اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے اعترافِ حقیقت کے طور پر لکھا۔

"میرا قطعًا یہ منشا نہیں تھا کہ میں زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے لوں یا آپ کو کسی قسم کا حکم دوں (حاشا و کلا۔ یہ چیز تو میرے حیطۂ تصور سے بھی باہر ہے) میں تو فی الحقیقت آپ سے درخواست کر رہا تھا۔ کہ آپ خود اس مسئلہ میں قیادت کیجئے اور ہندوستان کی اہم سیاسی جماعت کے قائدِ اعظم ہونیکی حیثیت سے دوسروں کو

دعوت دیجئے۔ کہ وہ آپ سے ملیں۔ اور اپنی "شکل" آپ کے سامنے پیش کر کے بالمشافہ معاملات پر بحث و تحیص کر لیں۔ میرا حقیقی منشاء تو آپ کو ہندوستان کے آمر کی حیثیت دینا تھا۔ اگر آپ اب بھی سمجھتے ہیں کہ میری تحریک کسی نہج سے بھی غیر دانشمندانہ تھی۔ تو مجھے واضح طور پر بتا دیجئے۔ یہ تو مجھ سے بہت بعید ہے کہ میں مسلم لیگ میں اختلاف پیدا کرنے کا موجب بن جاؤں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے بلا تکلف اور آزادانہ طور پر لکھ دیں گے۔ تا کہ اگر مجھ سے نادانستہ مسلم لیگ کی شہرت کو کسی طرح کا نقصان پہونچ گیا ہو تو میں اپنی غلطی کی تلافی کر دوں"

(اسٹیٹسمین ۱۹ اپریل)

یہ ہے ایک مرد مخلص کی صحیح روش سینہ کی اتنی وسعت صرف خلوص ہی پیدا کر سکتا ہے البلیسانہ سیاست کی مصلحت انگیزیاں تو قلب و نگاہ دونوں کی وسعتیں چھین لیتی ہے۔

(۲) آزادی کانگریس کا دعویٰ ہے کہ وہ آزادی چاہتی ہے۔ حتیٰ کہ اب ان کی آخری مہم تو جاری ہی اس غرض کے لئے کی گئی ہے کہ انھیں مافی الضمیر کے اظہار کی پوری پوری آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ لیکن دیکھئے کہ آزادی کے ان مدعیوں نے خود اپنی روش کیا ہے۔ جب سی۔ پی میں کانگریس حکومت کی "نظام شاہی" چل رہی تھی تو ناگپور کے ایک اخبار ہتوا نے صدر کانگرس بابو راجندر پرشاد کے کسی طرز عمل پر تنقیدانہ مضمون شایع کر دیا۔ اس پر کانگریس کی حکومت شعلہ بہ پیرہن ہو گئی کہ ہیں! ہماری حکومت اور ہمارے صدر پر تنقید! کسے اتنی جرأت ہو سکتی ہے؟ اس اخبار کے نام حکومت کی طرف سے ایک عتاب نامہ موصول ہو گیا جسکے دوران میں تحریر تھا۔

" ہاں یہ درست ہے کہ حکومت نے وہ تمام مراعات چھین لئے ہیں جو اس اخبار کو اس وقت تک حاصل تھے۔ حکومت اس اقدام پر مجبور ہو گئی ہے۔ زیادہ اس لئے نہیں کہ اس اخبار نے حکومت کے خلاف بے بنیاد اتہامات کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس نے صدر کانگریس کی طرف ہتک آمیز

اور قابلِ اعتراض انداز میں اشارہ کیا ہے۔اگر یہ اخبار صدر کانگریس کے متعلق
ان ریمارکس کو واپس لے لے جو اس نے مسرا کے مشہور مقدمہ کے سلسلہ میں
اپنے ہاں لکھے ہیں اور معافی مانگے تو معاملہ پر نظرِ ثانی کی جائیگی۔

(اسٹیٹسمین ۲ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس اخبار کا سنگین جرم! صدر کانگریس پر تنقید!! یہ ہے وہ قوم جو
ہندوستان پر حکومت کے ارادے رکھتی ہے اور دوسروں سے مافی الضمیر کے اظہار کی آزادی
کے مطالبے کرتی ہے۔

خیر گذری جو تو خدا نہ ہوا

---

(۳) ہندو ذہنیت اوائل مارچ میں لاہور میں ہندو اقلیتوں کے صوبوں کی ایک
کانفرنس منعقد ہوئی۔ (جسے عام طور پر اینٹی پاکستان کانفرنس) کہا جاتا تھا۔ کانفرنس کے صدر
ڈاکٹر ایس۔پی۔مکرجی نے اپنی تقریر میں بڑے بڑے اہم حقائق کو بے نقاب فرمایا۔ چنانچہ
انھوں نے کہا۔

"ہمیں لفظِ ہندو کی کسی تنگ معنیٰ میں تعبیر نہیں کرنا چاہیئے۔بلکہ ہر وہ شخص جو اس
ملک کو پتر بھومی اور دھرم بھومی تسلیم کرتا ہو اُسے ہندو کہنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔
اس لئے کہ جب تک ہم اس وسیع تصور ہندو ہیت کے ماتحت ۲۸ کروڑ ہندوؤں کو
متحد نہ کرلیں گے ہم اغیار کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔"

(اسٹیٹسمین ۲۰ء)

یعنی حقیقت یہ نہیں کہ ہندوستان کے ۲۸ کروڑ باشندے فی الواقعہ ہندو ہیں بلکہ
ہمیں (ہندوؤں کو) ضرورتِ وقت نے مجبور کردیا ہے کہ وہ اب ہندو کی کوئی ایسی تعریف
(DEFINITION) مرتب کریں جس کی رُو سے یہاں کے ۲۸ کروڑ باشندے

ہندوؤں کے حلقہ میں آ جائیں۔ حالانکہ ان ۲۸ کروڑ میں کروڑوں ایسے بھی موجود ہیں جو چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم ہندو نہیں ہیں۔ پچھلے دنوں مسٹر جیبا لی سنگھ پریذیڈنٹ آل انڈیا "آدھی باسی" مہاسبھا نے وزیر اعظم بنگال کو ایک خط کے دوران میں لکھا۔

> ہندوؤں کا پروپیگنڈہ بہت سی فریب دہی کا موجب بن رہا ہے اور ہزاروں آدھی باسیوں کو خوامخواہ ہندو لکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ کسی صورت میں بھی ہندو نہیں ہیں۔ آدھی باسیوں کا اپنا الگ مذہب ہے جسکا نام "سرم بھرم" ہے۔ وہ مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔ ان میں سے کئی ایک گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں ذات پات نہیں۔ ان میں اور ہندوؤں میں مذہب کی کوئی چیز بھی مشترک نہیں اور انھیں ہندو کہنا صریحاً شرارت ہے۔ (اسٹیٹسمین ۲۰؍)

اس ذہنیت کا اندازہ فرمائیے۔ یہ تو غنیمت جانیے کہ مسلمانوں میں اتنی بیداری پیدا ہو چکی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک الگ جماعت سمجھنے اور سمجھانے پر مُصر ہیں ورنہ کیا عجب تھا کہ ہندو انھیں بھی ہندو ہی لکھاتا۔ کہئے کہ جس قوم کی سیاست کی اساسات یہ ہوں۔ کوئی شخص یا جماعت اپنے مفاد ان کے سپرد کر سکتی ہے ؟

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمان کی روزمرّہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدّن و معاشرت کے خط و خال، اس کی تعلیم و تہذیب۔ اس کے دنیاوی معاملات۔ اپنوں و بیگانوں سے اسکے تعلّقات غرضیکہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لُطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہیں بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ر محصول ار

ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

نمبر ڈی بر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوع اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہوجاتا ہے۔ اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آنا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے اور قیمت فی پرچہ (۸) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو اس کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔پی طلب کرنے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلاجرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں۔ اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں کرنا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "طلوع اسلام" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس سے اشتراک عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کے لئے مہر کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم

ادارہ طلوع اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.